SOCRATES, THE MAN WHO DARED TO ASK

دُنیائے فلسفہ کا سب سے عظیم اور جلیل المرتبت معلم

سُقراط

نایاب تاریخی تصاویر کے ساتھ

کورا میسن

فہرست

سوانحی خاکہ

سقراط دُنیائے فلسفہ کا سب سے عظیم اور جلیل المرتبت معلم تھا۔ جس نے پانچویں صدی قبل مسیح میں یونان میں مغربی فلسفہ کی بنیاد رکھی۔

حیات:

سقراط 470 ق م میں یونان کے معروف شہر ایتھنز میں پیدا ہوا۔ اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں تحریری شواہد ناپید ہیں۔ تاہم افلاطون اور مابعد فلسفہ کے حوالے بتاتے ہیں کہ وہ ایک مجسمہ ساز تھا، جس نے حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر کئی یونانی جنگوں میں حصہ لیا اور دادِ شجاعت دی۔ تاہم اپنے علمی مساعی کی بدولت اُسے گھر بار اور خاندان سے تعلق نہ تھا۔ احباب میں اس کی حیثیت ایک اخلاقی و روحانی بزرگ کی سی تھی۔ فطرتاً سقراط نہایت اعلیٰ اخلاقی اوصاف کا حامل، حق پرست اور منصف مزاج اُستاد تھا۔ اپنی اسی حق پرستانہ فطرت اور مسلسل غور و فکر کے باعث اخیر عمر میں اس نے دیوتاؤں کے حقیقی وجود سے انکار کر دیا، جس کی پاداش میں جمہوریہ ایتھنز کی عدالت نے 399 قبل مسیح میں اسے موت کی سزا سنائی اور سقراط نے حق کی خاطر زہر کا پیالہ پی لیا۔

طریقۂ تعلیم:

سقراط نے دُنیا کو ایک نئے انداز مبحث سے متعارف کروایا۔ اس کا طریق بحث فسطائی قسم کا تھا، مگر اسے مناظرہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ اپنی بحث سے اخلاقی نتائج تک پہنچتا اور حقیقت ثابت کرتا۔ وہ پے در پے سوال کرتا اور پھر دوسروں پر اُن کے دلائل کے تضادات عیاں کرتا اور یوں مسائل کی تہہ تک پہنچ کر منطقی و مدلل جواب سامنے لاتا۔

بنیادی نظریات:

فی زمانہ سقراط کی کوئی تصنیف موجود نہیں تاہم اس کے شاگردِ رشید ''افلاطون'' نے اس کے نظریات کو قلمبند کیا ہے اور اپنی ہر دوسری تحریر میں اس کے حوالے دیئے ہیں۔ اس کے نظریات کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

- روح حقیقی مجرد ہے اور جسم سے جدا ہے۔ جسم کی موت رُوح کا خاتمہ نہیں بلکہ اس کی آزادی کی اِک راہ ہے، لہٰذا موت سے ڈرنا حماقت ہے۔
- جہالت کا مقابلہ کرنا چاہیے، اور انفرادی مفاد کو اجتماعی مفاد کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔
- انسان کو انصاف و ظلم، اور سچ و جھوٹ میں ہمیشہ تمیز روا رکھنی چاہیے۔
- حکمت و دانش لاعلمی کے ادراک میں پنہاں ہے۔

بحوالہ: وِکی پیڈیا (انٹرنیٹ انسائیکلوپیڈیا)
http://en.wikipedia.org/wiki/Socrates

مُقدّمہ

فلسفہ عام طور پر ایک خشک مضمون شمار ہوتا ہے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی اس کی شگافیوں سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ استدلال کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں۔ اکثر اوقات تو یہ بھی سمجھنا دشوار ہوتا ہے کہ مسئلہ زیر بحث کیا ہے، اس کے مسائل زندگی کے انتہائی مسائل ہوتے ہیں۔ میں کیا ہوں؟ یہ کائنات کیا ہے؟ نیکی اور بدی کا مفہوم کیا ہے؟ ہستی کیا ہے؟ ہستی کسے کہتے ہیں؟ زندگی کی کوئی غایت بھی ہے یا نہیں اور اگر اس کا کوئی مقصد ہے تو وہ کیا ہے؟ عام لوگوں کو نہ یہ فرصت ہوتی ہے اور نہ ان میں صلاحیت اور جستجو ہوتی ہے کہ زندگی کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہوں اور پھر یہ سوالات بھی ایسے ہیں کہ ان کا کوئی قطعی اور تسلی بخش جواب انسان کی دسترس سے باہر ہے۔ اسی لئے اکثر لوگ فلسفے کی کاوشوں کو سعی لاحاصل سمجھتے ہیں۔ فلسفیانہ جستجو کی بابت کسی کی ظریفانہ تنقید مشہور ہے کہ اندھے لوگ اندھیرے میں ایک کالی بلی کو ڈھونڈ رہے ہیں جس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ فلسفے سے گریز اور اس کی طرف سے مایوسی کے

اور بھی کئی اسباب ہیں لیکن ایک بڑا سبب فلسفے کی زبان اور اس کا پیچ در پیچ استدلال ہے۔ اس لئے کبھی کوئی صوفی پکار اٹھتا ہے کہ ۔

رہ عقل جز پیچ در پیچ نیست

بر عاشقاں جز خدا ہیچ نیست

اور کبھی حافظ کی طرح یہ نصیحت کی جاتی ہے:۔

حدیث از مطرب ومے گو وراز دھر کمتر جو

کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

لیکن انسان عقل سے روگردانی کیسے کرسکتا ہے۔ انسان اور دیگر حیوانات میں فرق وامتیاز آخر عقل ہی کی بدولت ہے بقول سعدیؒ: ۔

آدمی را عقل باید در بدن

ورنہ جاں در کالبد دار دحماد

فلسفی اس شخص کو کہتے ہیں جو حکمت پسند ہے اور عقل کی طرف سے مایوس نہیں جو اس کا قائل ہے کہ حیات و کائنات میں کچھ مطلق اور مستقل صداقتیں پائی جاتی ہیں اور انہی صداقتوں کی تلاش اور تلاش کے بعد زندگی کو ان کے مطابق ڈھالنا زندگی کا مقصود اور بہترین شغل ہے۔

اقوام عالم میں چند ہی قومیں ایسی گزری ہیں جنہوں نے بحث وتحقیق سے حقائق حیات کی گرہ کشائی کی کوشش کی۔ اس حیثیت سے کوئی قوم قدیم یونانیوں کی ہم پلہ نہیں۔ یونانیوں میں بھی تین مفکرین ایسے ہیں جن کے افکار نے آئندہ آنے والی بیشمار نسلوں پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ سقراط،

افلاطون اور ارسطو۔ سقراط افلاطون کا استاد اور مرشد ہے اور ارسطو افلاطون کا شاگرد ہے۔ اس لحاظ سے سقراط افلاطون اور ارسطو دونوں کا استاد ہے اور وہ اس تمام فلسفے کا سرچشمہ ہے۔ جو دو ہزار سال سے زائد عرصہ سے مشرق و مغرب کے اذہان پر مسلط ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس مفکر کی خود نوشتہ کوئی تصنیف نہیں ہے اس نے قلم سے ایک حرف نہیں لکھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وعظ و خطابت کا قائل نہیں۔ عوام یا خواص کے مجمعوں میں کبھی کسی موضوع پر لیکچر نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک وعظ یا لیکچر بھی کارگر اور مؤثر ذریعہ تحقیق یا وسیلہ بیان نہیں۔ سقراط عمر بھر باتیں ہی کرتا رہا۔ کبھی دو چار یا پان سات احباب کی گھریلو محفل میں اور کبھی شہر کے بازار اور چوک میں سرراہے کچھ کہتا ہے، کچھ سنتا ہے۔ اسکا انداز یہ نہیں ہے کہ اپنے آپ کو عالم اور مخاطب کو جاہل سمجھ کر کچھ علم بگھارنا شروع کر دے۔ وہ معمولی گفتگو میں بات میں بات پیدا کرتا ہے، ایک سوال کرتا ہے، مخاطب کو جواب پر آمادہ کرتا ہے۔ سوال میں سے جواب اور جواب میں سے سوال پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ متکلم اور مخاطب دونوں مل کر کسی صحیح نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اکثر اوقات ان مکالموں میں کوئی قطعی نتیجہ برآمد ہوتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ کوئی شخص یہ پوچھ سکتا ہے کہ آخر اس کھیل سے کیا فائدہ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تلاش حق میں پہلا مرحلہ یہ ہے کہ جن باتوں کو عوام نے بے سوچے سمجھے رسوم و روایات کی بنا پر مسلمات سمجھ رکھا ہے۔ ان کے اس یقین باطل کو متزلزل کیا جائے تا کہ وہ از سرنو خود سوچنے اور نتائج اخذ کرنے کی کوشش کریں۔ صداقت ہر جگہ موجود ہے لیکن اس کا اخذ

کرنا فکر مسلسل کا طالب ہے۔

سقراط غفلیت کا نبی ہے اور اسکا طرز تلقین دیگر انبیاء سے الگ ہے وہ یہ نہیں کہتا کہ اے لوگو! عالم بالا سے کچھ حقائق مجھ پر منکشف ہوئے ہیں۔ تم مجھ پر اعتماد کر کے ان پر ایمان لے آؤ۔ وہ لوگوں کو جستجوئے حقیقت کی مشق کرانا چاہتا ہے۔ وہ اپنے آپکو اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ گویا میں بھی کچھ نہیں جانتا۔ ایشیا والوں نے ڈلفی کی کاہنہ سے پوچھا کہ ہمارے شہر میں سب سے دانا شخص کون ہے؟ اس نے جواب دیا کہ سقراط۔ لوگ یہ سن کر حیران ہوئے کہ سقراط تو اپنے تئیں نادان کہتا ہے۔ اور یہ صاحبۂ الہام اس کو عاقل ترین قرار دیتی ہے۔ سقراط سے پوچھا کہ یہ کیا تضاد ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اس میں کوئی تضاد نہیں۔ نادان تم بھی ہو اور میں بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں اپنی نادانی سے آگاہ ہوں اور نادانی سے آگاہ رہنا ہی عقلمندی ہے۔ کہتے ہیں کہ سقراط کی ماں یا پیشہ ور دایہ تھی یا اس معاملے میں اپنی ہنرمندی سے بچہ جننے والی ماؤں کی مدد کرتی تھی اور اس کا باپ سنگ تراش تھا۔ سقراط بھی آفرینش افکاری میں تمام عمر اپنی ماں اور اپنے باپ ہی کے انداز کا کام کرتا رہا۔ اسکا عقیدہ تھا کہ صداقت نفس انسانی میں اسی طرح پنہاں ہے جس طرح بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے، یا ہر قسم کا خوبصورت بت ناتراشیدہ سنگ کے اندر مضمر ہے۔ دایہ بچے کی آخر مددگار نہیں وہ فقط اسے باطن سے ظاہر میں آنے میں مدد دیتی ہے۔ اسی طرح سنگ تراش اپنی ہتھوڑی اور چھینی سے پتھر میں سے اس صورت کو معرض وجود میں لے آتا ہے جو اس کے اندر مضمر تھی۔ صداقتیں باہر سے کسی شخص کے

دل و دماغ میں نہیں ڈالی جاتیں۔ تعلیم و تربیت کا کام ان کو بطون سے ظاہر میں لانا ہے۔ وہ لوگوں کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ حقیقت مطلقہ موجود ہے جو خیر مطلق ہے۔ ہر شخص فطرتاً خیر کا طالب ہے لیکن جہالت کی وجہ سے شر کو خیر سمجھ لیتا ہے اس لئے زندگی میں مسلسل کوشش یہی ہونی چاہیے کہ جہالت کو دور کیا جائے تاکہ لوگ خیر اور شر میں امتیاز کر سکیں۔ جو شخص پختہ طور پر کسی بات کو خیر سمجھے گا وہ ضرور اس کے مطابق عمل کرے گا۔ سقراط کہتا ہے کہ کوئی شخص جان بوجھ کر شر کی پیروی نہیں کرتا۔ وہ اپنی جہالت سے پہلے اسے خیر سمجھ لیتا ہے اور اس پر عامل ہوتا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ کئی لوگ خیر و شر کی ماہیئت کو حکیمانہ انداز میں جانے بغیر بھی نیک ہوتے ہیں اور اعلیٰ درجے کے اعمال ان سے سرزد ہوتے ہیں تو سقراط اس کو یہ جواب دیتا تھا کہ بے سمجھے نیکی کرنے والے سے بے سمجھے بدی بھی سرزد ہونے کا امکان ہے۔ علاوہ ازیں جب وہ خیر و شر کی ماہیئت کو نہیں سمجھتا تو وہ دوسروں کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ نیکی کی تعلیم نہیں دے سکتا۔ اسی لئے بعض نیکوں کی اولاد بد ہوتی ہے۔ ایشیا کے لئے بے شمار بھلائی کے کام کرنے والا رہبر پیریکلیز بھی اپنی اولاد کو نیک نہ بنا سکا۔

سقراط کے مکالمات کو اس کے نابغہ شاگرد حکیم افلاطون نے اپنی تصانیف سے لافانی بنا دیا ہے۔ اگر حسنِ تقدیر سے ایسا ادیب و حکیم شاگرد اس کو میسر نہ آتا تو آج تاریخ فلسفہ میں سقراط دیگر سینکڑوں ناموں کی طرح محض ایک نام ہوتا اور چند فقروں میں یہ کہہ دیا جاتا کہ وہ ایسی ایسی تعلیم دیتا تھا لیکن مکالمات افلاطون میں سقراط دو ہزار برس کے بعد آج بھی زندہ بگویا اور سخن طراز

ہے۔ خیر وشر کا مسئلہ انسان کے لیے کوئی ہنگامی اور وقتی مسئلہ نہیں۔ اسی لیے مرد بر ہے سقراط کی تحقیق و تلقین کبھی دفتر پارینہ نہیں بن سکتی۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص آج بھی فلسفہ اخلاق لکھنے بیٹھے اور وہ سقراط کے افکار اور اس کی بحثوں کو نظر انداز کر دے۔ کوئی اس سے اتفاق کرے یا اختلاف، بہر حال بنیادی حقائق اس کے پیدا کردہ مسائل سے ضرور نپٹنا پڑے گا۔

سقراط کے زمانے سے لے کر آج تک اس کی تعلیمات کی تشریح، تائید یا تردید میں لاتعداد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مؤرخین فلسفہ نے بھی اس کی تعلیم کے امتیازی پہلوؤں کو واضح کرنے کی عالمانہ کوششیں کی ہیں۔ اس ناچیز نے بھی تیس برس فلسفہ کی پروفیسری کرتے ہوئے سقراط کی غیر معمولی شخصیت کے نقوش کو طلبہ فلسفہ کے لئے اجاگر کرنے کی کوشش کی لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ جس دلکش انداز سے اس کتاب کی مصنفہ کورا میسن نے سقراط کے ماحول اور اس کی تعلیم کے اہم پہلوؤں کو عام قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس کی نظیر کسی کتاب میں نہیں مل سکتی۔ فلسفے کو مادی سے زیادہ دلکش بنا دینا۔ غیر معمولی ادبی استعداد اور تاریخی تخیل کا طالب ہے اور یہ دونوں صفات مصنفہ میں بدرجہ کمال موجود ہیں۔ سقراط کے معاصرین اور اسکے تلامذہ کے منتشر بیانات کو اس طرح پیش کرنا کہ نہایت درجہ کا ارتقائے فکر روز روشن کی طرح واضح ہو جائے اور پڑھنے والا منطقی استدلال کی پیچیدگیوں میں الجھ کر برداشتہ خاطر نہ ہو فلسفیانہ ادبیات میں کم یاب اور بے حد قابل تحسین کوشش ہے۔ اس کتاب میں فلسفہ ایک طالب حق کی جستجو میں سے فطری طور پر ظہور پذیر ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

سقراط کے ہاں فلسفہ کتاب سے نہیں بلکہ زندگی سے براہ راست ابھرتا ہے۔ سقراط نے اپنے آپ کو طبیعیات اور ریاضیات کے مسائل میں نہیں الجھایا۔ تمام علم کی تقسیم اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ ایک علم وہ ہے جو خارجی فطرت یا آفاق کا علم ہے اور دوسرا علم خود نفس انسانی کا علم ہے۔ سقراط نے آفاق سے قطع نظر کر کے پوری توجہ نفوسِ انسانی کے مطالعہ میں صرف کی۔ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے یا زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، اس سے خیر و شر کے مسئلہ میں تو کوئی فرق نہیں آتا۔ ریاضی کا کوئی مسئلہ حل کر لینے سے کوئی خاص تزکیۂ نفس پیدا نہیں ہوتا۔ انبیاء میں سے کوئی بھی طبعی سائنس کا ماہر نہ تھا ان کی تمام کوششیں عرفانِ نفس میں صرف ہوئی تھیں۔ سقراط بھی انبیاء کی طرح اس کا قائل تھا کہ من عرف نفسہ، فقد عرف ربہٗ. ایسی عرفان نفس کی بدولت اس کو الوہیت کا بھی وہ عرفان حاصل ہوا جو اس کے معاصرین میں سے کسی کو نصیب نہ تھا۔ سقراط کی تمام عقلی جدوجہد اس کو توحید کی طرف لے آئی۔ اس نے دیوتاؤں کے وجود سے انکار نہیں کیا۔ لیکن اس کے ہاں دیوتا خیر مطلق کے رہبر بن گئے اور ان کو قریباً وہی حیثیت حاصل ہو گئی جو اسلام اور عیسائیت میں ملائکہ کو حاصل ہے اس کو یقین تھا کہ ایک دیوتا یا فرشتہ اس کی رہبری کے لئے مقرر ہے۔ وہ اسے کسی کار خیر کا حکم تو نہیں دیتا لیکن اس کو غلط روی سے روک دیتا ہے۔ جب تک صراط مستقیم پر گامزن رہتا ہے تو وہ مداخلت نہیں کرتا لیکن اگر کوئی اقدام غلط ہو تو فوراً مزاحم ہو جاتا ہے۔ اخلاقی زندگی اور الوہیت کی نسبت وہ عقلی جستجو سے ایسے نتائج پر پہنچ گیا جو اس کو ان توحیدی مذاہب کے قریب لے آئے جن کا مآخذ

استدلال نہیں بلکہ وحی الٰہی ہے اس نے دنیا کے سامنے یہ عقیدہ پیش کیا کہ عقل اور وحی میں کوئی تصادم نہیں اگرچہ اس کے وحی کا انداز عام مفہوم سے مختلف ہے۔ سقراط نے اپنے ہم وطنوں کی عقل اور ان کے اخلاق کے تزکیہ کی کوشش کی اور ہر کس و ناکس کو یہ تلقین کی کہ اپنی زندگی اور اپنے نفس کا مسلسل محاسبہ کرتے رہیں۔ وہاں تحقیق حق کو سوفسطائیوں نے مضحکہ خیز بنا رکھا تھا اور استدلال ایک کھیل بن گیا تھا۔ یہ لوگوں اور ان کے بیٹوں سے بڑی بڑی اجرتیں وصول کر کے ان کو خطابت اور وکالت کا فن سکھاتے تھے تاکہ وہ سیاسی لیڈری کے لئے اہلیت پیدا کر لیں اور ان کی تمام کوششوں کی اساس یہ تھی کہ کوئی بات نہ مطلق حق ہے اور نہ مطلق باطل اور خیر و شر کی تمیز بھی انسانوں کے مفاد یا روایات و توہمات کی پیداوار ہے۔ اقبال نے خوب کہا ہے کہ انساں ہمہ راز بے یقینی۔ سوفسطائیوں کو کسی صداقت پر ایمان نہیں رہا تھا اور سقراط کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر یہ صورت حال قائم رہی تو یہ قوم مغلوب اور فنا ہو جائے گی۔ سقراط اور اس کے نابغہ شاگرد افلاطون کی مسلسل عقلی جدوجہد یہی تھی کہ لوگوں میں حقائق مطلقہ کا یقین پیدا کریں۔ اس ضمن میں وہ ایسا کام کر گئے ہیں کہ آج بھی کوئی مفکر یا مصلح اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ سقراط زندہ جاوید انسانوں میں ہے اور اس کتاب کی مصنفہ کورا میسن نے اس کی شخصیت اور تفکر کی ایسی جیتی جاگتی تصویر کھینچی ہے جو کسی محض مؤرخِ فلسفہ کے بس کی بات نہ تھی جب تک کہ تخیل اس کا ہم عنان نہ ہو۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

سخن ہائے گفتنی

"صداقت نفس انسانی میں اسی طرح پنہاں ہے جس طرح بچہ ماں کے پیٹ میں چھپا ہے یا ہر قسم کا خوبصورت بت ناتراشیدہ سنگ کے اندر مضمر ہے۔ دایہ بچے کی مددگار نہیں وہ فقط اسے باطن سے ظاہر میں آنے میں مدد دیتی ہے اسی طرح سنگ تراش اپنی ہتھوڑی اور چھینی سے پتھر میں سے اس صورت کو معرض وجود میں لے آتا ہے جو اس کے اندر مضمر تھی۔ صداقت باہر سے کسی شخص کے دل و دماغ میں نہیں ڈالی جا سکتی۔ تعلیم و تربیت کا مقصد اسے (صداقت کو) باطن سے ظاہر میں لانا ہے۔ ہر شخص فطرتاً خیر کا طالب ہے لیکن جہالت کی وجہ سے شر کو خیر سمجھ لیتا ہے۔ اسی لئے زندگی میں مسلسل یہی کوشش ہونی چاہئے کہ جہالت کو دور کیا جائے تاکہ لوگ خیر و شر میں امتیاز کر سکیں"۔

یہ الفاظ ہیں اس شخص کے جس کے زمانے سے لے کر آج تک اس

کی تعلیمات کی تشریح، تائید اور تردید میں بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اسے دنیا ''سقراط'' کے نام سے جانتی ہے۔ جسے فلسفے کا باوا آدم بھی کہا جاتا ہے۔ فلسفی اس شخص کو کہتے ہیں جو حکمت پسند ہو اور عقل کی طرف سے مایوس نہ ہو۔ جو اس بات کا قائل ہو کہ حیات و کائنات میں کچھ مطلق اور مکمل صداقتیں پائی جاتی ہیں اور انہی صداقتوں کی جستجو اور بعد میں انہی صداقتوں کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنا اس کا مقصود ہو۔ اگر انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ایسی چند ہی اقوام کا وجود ملے گا جنہوں نے تحقیق و مباحث کے ذریعے زندگی کی حقیقتوں کی گتھی کو سلجھایا ہو۔ اس سلسلہ میں کوئی بھی قوم یونانیوں کے ہم پلہ قرار نہیں دی جا سکتی۔ خاص طور پر تین یونانی مفکرین ایسے ہیں جن کے افکار نے آنے والی نسلوں پر بہت گہرے نقوش ثبت کئے ہیں۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو۔

افلاطون سقراط کا شاگرد اور ارسطو افلاطون کا شاگرد تھا۔ اسی لحاظ سے سقراط افلاطون اور ارسطو دونوں کا استاد تھا۔ سقراط نے کوئی تصنیف نہیں چھوڑی بلکہ اس کے افکار کو افلاطون نے ہی دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ افلاطون نے سقراط کے مکالمات کو اپنی تصانیف سے لافانی بنا دیا۔ اگر سقراط کو افلاطون جیسا لائق شاگرد میسر نہ آتا تو آج فلسفہ کی تاریخ میں اس کا نام و نشان بھی شاید باقی نہ رہتا۔ خیر و شر کا فلسفہ ہی لے لیجئے! یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص آج فلسفۂ اخلاق پر کچھ لکھنے بیٹھے تو وہ سقراط کے افکار و مباحث کو نظر انداز کر دے۔ چاہے اسے سقراط سے اتفاق ہو یا اختلاف۔ سقراط کا فلسفہ کسی کتاب سے نہیں بلکہ براہِ راست زندگی سے ہی ابھرتا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو طبیعات اور ریاضیات

جیسے مسائل میں نہیں الجھنے دیا۔ اس کی تمام کوششیں عرفانِ نفس سے متعلق تھیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ کوششیں اسے توحید کے قریب لے آئیں تھیں تو یہ بے جا نہ ہو گا۔ گو اس نے دیوتاؤں کا مکمل طور پر انکار نہیں کیا مگر اس کے ہاں دیوتا خیرِ مطلق کے رہبر بن گئے۔ دوسرے لفظوں میں دیوتاؤں کی حیثیت اس کے قریب ایسی ہی تھی جیسی اسلام اور عیسائیت میں ملائکہ کی ہے۔

میرے خیال کے مطابق سقراط کی زندگی پر اور اس کے فلسفے کو کافی حد تک سمجھنے کیلئے یہ ایک بہترین تصنیف ہے۔ اس کتاب کی مصنفہ کورا میسن نے سقراط کے ماحول اور اس کی تعلیم کے اہم پہلوؤں کو عام قارئین کے سامنے اجاگر کیا ہے۔ جسے "بک کارنر شوروم جہلم" نے شائع کر کے اپنی علم دوستی کا ایک اور ثبوت مہیا کیا ہے۔

حکیم مرزا صفدر بیگ

پیش لفظ

ہر بوڑھا کبھی بچہ تھا۔ چاہے کسی قسم ہی کا کیوں نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ
بے دنیا کو نیا کہلا کہنے والے بوڑھے، بچپن میں بالکل مختلف مزاج رکھتے
ہوں لیکن یہ باور کرنا مشکل ہے کہ سقراط نے عظمت سفر حیات کی آخری منزل
پہنچ کر حاصل کی ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شروع ہی سے خوش طبع تھا اور مبہم
ہے۔

سقراط کے بچپن کے متعلق کسی نے تفصیلی بات نہیں کی۔ اس کا دوست
ایس پیاد بجلی کی طرح چمکا اور غائب ہو گیا لیکن لوگوں نے اسے سقراط کی
نسبت زیادہ اہمیت دی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں بس وہ نشوونما پاتا رہا بلکہ
یوں کہنا چاہیے کہ وہ عمر بھر نشوونما پاتا رہا ستر سال تک یہی ہوتا رہا اور لوگ بھی
یہی کچھ کرتے ہیں فرق یہ ہے کہ سقراط نے اپنا کام بہتر طریقہ پر کیا۔ اس
زمانے میں لوگوں کے سوچنے کا جو منتشر سا انداز تھا سقراط اس کی بھول بھلیاں
نی سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسکے بعد اگر لوگوں کو پہلے سے بہتر

طریقے پر سوچنے کا موقع ملا تو حقیقت یہ ہے کہ بڑی حد تک سقراط ہی کا کارنامہ تھا۔

یہ درست ہے کہ سقراط کے بچپن کے متعلق حقیقت ماضی کی دھند میں مخفی ہے اور اس حقیقت تک پہنچنے میں دشواریاں بھی بڑی ہیں۔ اس کے باوجود ان کے ان دشواریوں کو رفع کرنے کی کوشش کرنا بہر حال مناسب اور روا ہے۔ سقراط نے خود تو کچھ لکھا نہیں کہ یہ اس کا طریق کار ہی نہ تھا لیکن عمر کے آخری حصہ میں جو دوست میسر آئے انہوں نے سقراط کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں اس کے ذہین دوست اور فلسفی شاگرد افلاطون کی تحریریں زیادہ ممتاز ہیں۔ جو شخص افلاطون کے ڈرامائی مکالمات پڑھے گا اسے اس بارے میں تو کوئی شک نہ رہے گا کہ سقراط ایک جیتی جاگتی شخصیت ہے البتہ یہ معاملہ ہمیشہ متنازع فیہ رہا ہے کہ ان مکالمات میں سقراط کے اصلی خدوخال کہاں تک نظر آتے ہیں؟ سقراط سے افلاطون کی محبت کو کہاں تک دخل ہے اور خود افلاطون کس حد تک مجسما گفتگو کر رہا ہے؟ میں نے اس کتاب میں ان مخصوص افکار سے قطع نظر کر لیا ہے جو افلاطون سے منسوب ہیں۔ ان سے بحث کرنے کا موقعہ ہی نہ تھا، لیکن سچ یہ ہے کہ سقراط کو اپنے دوستوں سے اور دوستوں کو اس سے جو محبت تھی اس کے تانے بانے ایسے الجھے ہوئے ہیں کہ نہ کوئی شخص انہیں سلجھا سکے گا اور نہ ایسی کوشش ہی مفید ثابت ہوگی۔

ہمارے دل میں سقراط کی ہمدردی کا جو جذبہ موجزن ہو جاتا ہے، وہ مزید پیچیدگی کا سبب بنتا ہے۔ چوبیس صدیاں گزر گئیں کہ سقراط ایسی دنیا میں

زندگی بسر کرتا تھا جہاں کفر اور بت پرستی کا دور دورہ تھا۔ اس کے باوجود ہم ان صدیوں کے تغیرات کو فراموش کر کے یہ محسوس کرتے ہیں گویا وہ ہمارا معاصر ہے۔ ہمیں اس بات کا شعور ہو یا نہ ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے الفاظ عیسائیت کے تصورات میں سموئے ہوئے ہیں اور ہمارے لئے یہ کچھ مشکل نہیں سقراط کے الفاظ میں بھی عیسائیت کی روح منعکس دیکھیں لیکن اس کی تمنا تو ہوگی کہ ہم اس کے لفظوں سے وہ مطلب اخذ کریں جو اس کے معاصر دوست مراد لیتے تھے۔ سقراط کی تحریروں میں اور پھر زینوفن کی تصانیف میں (جو سپاہی بھی تھا اور صحافی بھی) ہمیں ساٹھ سال کا وہ سر تا سیانا پراتم بڈھا دکھائی دیتا ہے۔ جسے بیس سال کے نوجوان بدل و جان چاہتے تھے لیکن ایک اور سقراط بھی ہے۔ جس سے آگاہ ہونے کی ضرورت ہے۔ ادھیڑ عمر کا سپاہی، نوجوان طالب علم، نوخیز لڑکا، بچہ۔ سقراط ان تمام منزلوں سے گزرا ہے لیکن افلاطون اور زینوفن نے اس سقراط کو نہیں دیکھا اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے دائرہ نظر سے بھی خارج ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

آغاز کار کے طور پر ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ ایک بچہ پیدا ہوا۔ یہ سنہ ۴۷۰ ق م کا واقعہ ہے۔ مقام ایتھنز تھا اور گھرانا ایسے افراد پر مشتمل جو نہ امیر تھے نہ غریب بلکہ متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ فینے ریتی اس کی والدہ کا نام تھا اور سوفرونس کس اس کے باپ کا۔ سقراط کو بعد میں معلوم ہوا کہ اسکی ماں ہمسایہ کی عورتوں کی مدد کیا کرتی تھی۔ بچہ پیدا ہوتے وقت وہ موقعہ پر موجود ہوتی تھی اور بڑے صبر اور الہامی مہارت سے کام لیتی تھی۔ سوفرونس کس غالباً ایک ماہر

کاریگر تھا۔ امیر کبیر گھرانے کا نونہال افلاطون اس بات کی طرف سرسری سا اشارہ کرتا ہے لیکن بڑے سلیقے سے۔ بعد کی داستانوں میں یہ بات بڑی تصریح سے کہی جاتی ہے کہ سقراط کا والد سنگ تراش تھا اور اس نے بیٹے کو اپنا ہنر سکھایا۔ یہ کوئی غیر متوقع بات نہ تھی۔ بیٹے کو (کہ سپوت تھا) باپ کے نقش قدم پر چلنا ہی تھا۔

تو تصور کیجئے کہ سقراط کے پیدا ہونے کا وقت ہے۔ سوفرونس کس بیوی کے بستر کے پاس کھڑا ہے اور اپنے نوزائیدہ بیٹے کے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہا ہے جو اسے ایک ماہر کاریگر کے ہاتھ معلوم ہوتے ہیں۔ اسے کیا خبر تھی کہ دراصل وہ ایک بہت بڑے فلسفی کا باپ کہلائے گا۔

سقراط نے فلسفی کی حیثیت سے بہت بعد میں جنم لیا۔ افکار و تصورات آہستہ آہستہ جنم لیتے رہے اور سقراط نے جب اس کی باری آئی تو دوسرے نوجوانوں کو بتایا کہ انسان دوبارہ یوں جنم لیتا ہے۔ یہ تو غالباً کبھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ سقراط کے ذہن میں افکار اور تصورات کی پہلی چنگاریاں کب سلگیں۔ ہم صرف یہ کر سکتے ہیں کہ افلاطون کی طرح اس راہ پر چل دیں جو صداقت کی منزل کی طرف جاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور پھر اپنی نئی کہانیوں کا تانا بانا تیار کر لیں۔

آنسہ صبیحہ حسن

دیباچہ

اس کتاب میں سقراط کی جو تعبیر میں نے پیش کی ہے اگرچہ وہ اصلاً زینوفن اور افلاطون کی تحریروں پر مبنی ہے لیکن میں نے دوسرے قدیم مصنفوں اور عصر حاضر کے عالموں کی تصنیفات سے بھی استفادہ کیا ہے اور اس کا شکریہ صرف عمومی طور پر ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس کے باوصف مجھے خاص طور پر اعتراف کرنا ہے کہ میں نے اپنے باب "طویل سفر" میں جو کچھ لکھا ہے وہ اے۔ آر۔ برنز کی تصنیف "فارقلیس اور ایتھنز" کے مندرجات پر مبنی ہے، جس میں اس مہم کی جس کے حالات قدامت کی دھند میں مخفی تھے ایسی تصویر کھینچی گئی ہے جو قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اسی سلسلہ میں میں نے مکالمات افلاطون کے اس ایڈیشن کے حواشی سے بھی مدد لی ہے جو جون برنٹ نے مرتب کیا ہے علاوہ ازیں ورنر جیگر کی تصنیف "پیدیا" کی دوسری جلد کے مندرجات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ لاکیز اور سمپوزیم میں افلاطون نے جن واقعات کا ذکر کیا ہے ان کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے میں نے افلاطون کے الفاظ کی تفسیر و تعبیر

میں خاصی آزادی سے کام لیا ہے۔ یہی روش دوسری کتابوں کے متعلق رہی ہے۔ اس آزادانہ تفسیر و تعبیر کا مقصد صرف یہ تھا کہ مکالمات کی دلالتیں واضح ہو جائیں کہ یہ تحریریں نیم افسانوی ہوتے ہوئے بھی سقراطی روایت کے بیش قیمت ماخذوں میں شامل ہیں۔ پہلے باب میں "طویل سفر" میں "السی بیادیز" میں جو مکالمات میں نے درج کئے ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ مختصراً افلاطون کے مطالب کی تشریح کر دی جائے۔ یہ جو روایت چلی آتی ہے کہ سقراط کا باپ سنگ تراش تھا میں نے اسی کو سقراط کی ابتدائی زندگی کی اساس بنا دیا ہے۔

میں خاص طور پر ان عالموں اور انشا پردازوں کی شکرگزار ہوں، جنھوں نے مجھے ہر طرح کی دوستانہ مدد دی (اگرچہ جو تفسیر و تعبیر پیش کی گئی ہے اس کی ذمہ داری ان پر نہیں) مسٹر گف ڈوو کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر اس لئے لازم ہے کہ انھوں نے کتاب کے متن کا انتقادی جائزہ لیا اور تصویروں کے متعلق مفید مشورے دیے۔ جولین فلپ (جونیئر) اور رابرٹ ٹیلی بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں۔ اولی الذکر نے سارا مسودہ پڑھا اور آخر الذکر نے نظرثانی کرنے میں بڑی فراخدلی سے اور بڑی بصیرت سے کام لے کر میری مدد کی۔

آخر میں مجھے خاص طور پر اپنے والد کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ انہی کی بدولت مجھے کلاسیکی ادب کا مطالعہ کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ انہی نے میری تربیت کی اور انہی کی وجہ سے یہ ممکن ہو سکا کہ میں اس موضوع پر کام کر سکوں۔

کورا میسن

بچپن کی کہانی۔ کرائٹو کی زبانی

اس وقت ہم اب سے دو ہزار چار سو برس پہلے کے قدیم شہر ایتھنز میں ہیں اور یہ زمانہ قریباً ساڑھے چار سو سال قبل مسیح کا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب روم کی حیثیت محض ایک غیر معروف قصبہ کی سی تھی۔ انگلستان ملاحوں کی زبان زد ایک داستان سے زیادہ نہ تھا اور امریکہ گویا خواب تھا۔ مغربی دنیا کی نظریں سب یونان پر مرکوز تھیں۔

کسی کو خبر بھی نہیں تھی کہ یونان کے اس قدیم شہر میں سقراط نام کا ایک لڑکا آہستہ آہستہ فلسفی بن رہا ہے۔ ہاں کرائٹو کو شاید اس بات کا شعور ہو۔ اسی نے شاید اس تغیر کا مشاہدہ کیا ہو۔ بڑھاپے تک اسے یاد رکھا ہو اور اسے یوں بیان کیا ہو جس طرح ہم کریں گے۔ اس کہانی کا باقی حصہ شروع سے آخر تک مختلف مقامات سے فراہم کیا گیا ہے۔ مؤرخین کی کتابیں، قدیم زمانے کے چھ اور سقراط کے کم عمر احباب، خصوصاً افلاطون اس کے ماخذ ہیں لیکن کہانی کا یہ پہلا حصہ صرف کرائٹو ہی کو یاد رہ سکتا تھا اور مناسب ہے کہ وہی اس زمانے کی داستان سنائے۔

میرا خیال ہے کہ غالباً میں نے سقراط کو پہلے پہل اسکول میں دیکھا

تھا۔ (یا ممکن ہے کہ اسکول کے دنوں سے پہلے ہی نہ دیکھا ہو کیوں کہ اس کا گھر میرے گھر سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں تھا) ان دنوں میں اسے ایتھنز کا سب سے بدصورت لڑکا تصور کرتا تھا۔ حالانکہ یہ بات کلیتاً صحیح نہیں تھی۔ اس لئے کہ اس کے چہرے پر نہ تو بد باطنی کے آثار تھے نہ داغ تھے اور وہ بیمار بھی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ جس گوشت پوست سے وہ بنا تھا وہ دوسرے بچوں کے مقابلے میں زیادہ سخت معلوم ہوتا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ ضدی ہے۔ اس کی آنکھیں مینڈک کی آنکھوں کی طرح باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس کے ہونٹ موٹے تھے۔ اس کی چپٹی ناک یوں نظر آتی تھی جیسے کسی نے بچپن ہی میں اسے مروڑ کے رکھ دیا ہو۔ اسکول میں لڑکے اسے مینڈک کہا کرتے تھے۔

میں آپ کو اس کے چہرے کی تفصیل بتا رہا ہوں۔ اگرچہ بہت جلد اس کی جلد اور ہڈیوں کی ساخت میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ دوستی میں ان باتوں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا یہ باتیں تو اجنبی دیکھتے ہیں۔ میری دوستی کی وجہ سے اس کا اپنا رویہ بھی اپنی شکل و صورت کے متعلق مختلف ہو گیا تھا۔ میں نے خود اس کو اپنی شکل پر ہنستے دیکھا ہے۔ میں نے اسے کہتے سنا ہے کہ اس کی جیسی آنکھیں گویا ہر سمت دیکھنے کے لئے بنائی گئی ہیں اور بھدی چپٹی سی ناک میں لمبی ستواں ناک کے مقابلے میں سونگھنے کی قوت زیادہ تیز ہوتی ہے۔ لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جب تک اس میں خود اپنی شکل صورت پر ہنسنے کی طاقت پیدا نہیں ہوئی تھی وہ اسی بات پر لڑکوں سے الجھ پڑا کرتا تھا اور جب اس نے بظاہر دوسروں سے لڑنا چھوڑ دیا تو ایک اندرونی کشمکش میں مبتلا ہو

گیا۔ تو یوں کہنا چاہئے کہ اس کی اس بدصورتی سے دور رس نتائج پیدا ہوئے اور کسی کو معلوم بھی نہ ہوا۔ تمام باتوں کو ملحوظ رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ خوش باش تھا اور اس کی نظریں خارجی دنیا کے واقعات کی ٹوہ لگاتی پھرتی تھیں۔ واقعے کے برسوں بعد کسی نے مجھ سے اس کی ایک دعا کا تذکرہ کیا۔ کچھ لوگ گھومنے پھرنے باہر گئے ہوئے تھے اور سقراط نے اس جگہ کے دیوتاؤں سے دعا مانگی۔ یہ دعا اس کی طبیعت کے عین مطابق تھی۔ (جب وہ خوش ہوتا تو دعا مانگا کرتا) وہ چاہتا تھا کہ اسے عقل کی دولت ملے اور ایسی متوازن روح بھی نصیب ہو جو اس دولت کے بوجھ کو اٹھا سکے اور یہ سادگی بھی اسے عطا ہو کہ اس کا ظاہر باطن یکساں ہو۔ لیکن اس کی دعا کے ابتدائی حصے نے مجھے زیادہ متاثر کیا۔ اس کے الفاظ تھے کہ "میرے باطن کو حسین بنا" جب مجھے یہ بات سنائی گئی تو مجھے یاد آیا کہ کئی برس ہوئے اس کے دل میں اس طرح کے خیالات پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے کہ حسن کیا ہے۔ حُسن کی حقیقت کیا ہے وغیرہ۔

جب میں "حسین" کہتا ہوں تو ہماری زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے آپ کے ذہن میں "خوش نمائی" کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ بات نہیں "حسین" کے معنی ہمارے یہاں لطیف و نفیس اور جلیل و عظیم کے ہیں اور ہم یہ لفظ اکثر استعمال کرتے ہیں لیکن جب سقراط نے حُسن کے مفہوم پر غور کرنا شروع کیا تو ہمارے لئے بھی شروع شروع میں اس کی بات اتنی ہی ناقابل فہم تھی جتنی آپ کے لئے ہے۔ پہلے جب مجھے اس بات کا شعور حاصل ہوا تو ہم جماعت میں بیٹھے موسیقی سیکھ رہے تھے۔ اس دن ہمارا بوڑھا استاد گلاکس ہو مر

کے اشعار ہم سے سن رہا تھا۔ ہم سر ہلا ہلا کے پڑھ رہے تھے، کونے میں رہتے ہوئے ڈنڈے کے ڈر سے صحیح الفاظ ادا کر دینے کے علاوہ اکثر تو میں اس بات کی طرف ذرا بھی توجہ نہ کرتا تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ لیکن اس مرتبہ گلاس نے ان بندوں کا انتخاب کیا تھا جو مجھے پسند تھے۔ یہ بات میں نے بھی محسوس کی اور سقراط نے بھی جو میرے ساتھ بیٹھا تھا۔

آپ کو یہ قصہ تو یقیناً یاد ہی ہوگا کہ بہادر ایکی لیز بادشاہ سے الجھ پڑا اور اس کے بعد جنگ کرنے سے انکار کر دیا لیکن جب ایکی لیز کا ایک دوست اس کی جگہ جنگ میں مارا گیا تو پھر کوئی اسے جنگ میں شامل ہونے سے باز نہ رکھ سکا۔ حالانکہ اس کی ماں نے جو ایک دیوی تھی اسے متنبہ کر دیا تھا کہ وہ موت کے منہ میں جا رہا ہے۔ اس موقع پر ایکی لیز نے ماں کے سامنے ایک شاندار تقریر کی اور کہا کہ مرنا قبول ہے لیکن دوست سے غداری نہیں کر سکتا اور اگر میں نے اس وقت لڑائی سے جان چرائی تو میں زمین کا بوجھ بن کر رہ جاؤں گا۔ یہ بڑی شاندار تقریر تھی اور اس کے الفاظ میں جنگ کی گھن گرج سنائی دیتی تھی۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ ایکی لیز کی ماں نے ہونے والے واقعات کے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ لفظ بلفظ صحیح تھا خود ایکی لیز بھی جانتا تھا کہ میری ماں ٹھیک کہہ رہی ہے اور یہ کہ بہت جلد میرے گھوڑے بھی میرا ماتم کریں گے۔ تو مجھے یہ تقریر بہت شاندار معلوم ہوئی اور میں نے سقراط کی طرف دیکھا کہ اس کا کیا خیال ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دنوں بھی سقراط کی رائے پر کان دھرنا پڑتا تھا۔

میں نے جھک کر سقراط کی طرف دیکھا کیونکہ ہم سن ہونے کے

پاؤنڈ وہ قد میں مجھ سے چھوٹا تھا۔ میں نے اس وقت اس کے چہرے پر وہ کیفیت دیکھی کہ جب اس کا ادادہ ہوا ہے مجھے لطف آیا ہے۔ اس کی مضحکہ خیز آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور اس کا بدصورت چہرہ اندرونی خوشی کے تاثر سے گویا دہک رہا تھا۔ "کراںتو! تم نے سنا؟ کتنی حسین چیز تھی اس نے آہستہ سے مجھ سے کہا۔ دونوں ڈنڈے کے ڈر سے خاموش رہے۔ تھوڑی دیر بعد ہی کسی شریر بچے نے گلاکس کی ناک کے عین نیچے ایک جھینگر اڑا دیا اور میں ایکی لیز کو بالکل بھول گیا۔

لیکن یہ بات کشتی کے مقابلے کے بعد مجھے یاد آ گئی اس وقت میں اپنے ہمعصروں میں کشتی کے فن کا سب سے بڑا ماہر پہلوان تھا۔ اگرچہ یہ میری تربیت کا ابتدائی زمانہ تھا اور ابھی میں بڑے بڑے کھیلوں میں شریک نہیں ہوا تھا لیکن اس دن میں نے اپنے فن کا بہت ہی اچھا مظاہرہ کیا تھا اور مجھے اس بات کا شعور بھی تھا۔ مجھے اس کامیابی کی زیادہ خوشی اس لئے تھی کہ سقراط کنارے بیٹھا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔

کشتی ختم ہونے پر ہم دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کپڑے بدلنے کے کمرے میں آئے ہم دونوں بے حد خوش تھے۔ سقراط بار بار کہہ رہا تھا "کراںتو! کتنی حسین کشتی ہوئی"۔ یہ الفاظ کوئی شخص بھی نہیں کہہ سکتا تھا لیکن سقراط کی زبان سے نکلے ہوئے ان الفاظ کے معنی بہت وسیع تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ خاموش ہو گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میں بھی خاموش تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ اب کچھ سوچ رہا تھا۔ "ہاں! حسین کراںتو" اس نے

ایک لحظہ کے بعد پھر کہا اور آج صبح وہ تقریر بھی حسین تھی ! ایکی لیز والی تقریر یاد ہے نا وہ بات اگرچہ اس سے بالکل مختلف تھی لیکن تھی حسین۔ میں سوچتا ہوں...... اور وہ پھر سوچنے لگا اور اس وقت تک سوچتا رہا جب تک میں اسے جھنجھوڑ کر اپنے ساتھ باہر مشق کرنے نہیں لے گیا۔

میں اس وقت نہیں سمجھ سکا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا اور میرے دل میں کوئی تجسس بھی نہ تھی کہ آخر بات کیا ہے۔ کئی دن کے بعد جب ہم لوگ ماؤس کی دوکان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت مجھ پر اس خاموشی کا راز کھلا۔ ماؤس ایک بدیسی کمہار تھا لیکن خوبصورت برتن بنانے کی وجہ سے سارے ایتھنز میں اسے شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ ہاں وہ تنک چڑا سا تھا۔ میں کبھی اس کی دوکان کے دروازے کے سامنے سے گزرا ہوں گا۔ اندر کبھی نہ گیا تھا۔ سقراط نے اس سے کسی طرح آشنائی پیدا کر لی تھی اور اس شام کو وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔

جب ہم لوگ اندر پہنچے تو ماؤس نے ایک نیا برتن چاک پر چڑھایا۔ سقراط نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ہم لوگ زمین پر ایک طرف کو بیٹھ گئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ نے کسی ماہر برتن بنانے والے کو کام کرتے دیکھا ہے کہ نہیں۔ اگر دیکھا ہے تو آپ سمجھ جائیں کہ ہم ایک طرف خاموش بیٹھے بیٹھے اکتائے کیوں نہیں۔

اس نے اپنے چاک پر مٹی کا ایک لونداچڑھا رکھا تھا۔ کافی دیر تک اس نے اس کھیل کے سوا اور کچھ نہیں کیا کہ کبھی مٹی کو ہاتھ سے لمبا کر دیتا اور کبھی اسے پھر نیچے بٹھا دیتا۔ اس دوران میں برابر غلام لڑکا چاک کو گھمائے جا رہا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا دن یہی کرتا رہے گا لیکن یکایک ایک تبدیلی واقع ہوئی۔ ماؤس نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے۔ مٹی کے لوندے میں انگوٹھے گاڑ دیئے پھر مٹی کو مٹھی میں پکڑ کر اوپر اٹھایا اور دیکھتے دیکھتے برتن کی شکل ظاہر ہونے لگی۔

یہ برتن اس طرح وجود میں آیا تھا جیسے کوئی جاندار شے نشوونما پائے۔ آپ اسے دیکھتے یہی کہتے کہ اس میں جان ہے۔ لیکن اس کی جان تو وہ نقشہ تھا جو ماؤس کے دماغ سے نکل کر اس کے ہاتھوں کے ذریعہ مٹی میں منتقل ہو رہا ہے۔ اس نقشہ نے مٹی کو ایک ہیئت دے دی۔ پہلے جس چیز کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ وہ برتن بن گئی تھی۔

میں نے سقراط کی طرف دیکھا اور سمجھ گیا کہ یہ بات بھی ایکی لیز کی تقریر اور کشتی کی طرح تھی۔ ہم دونوں کو اس بات کا احساس تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ماؤس نے کچھ ناپنے کے لئے چاک کو روکا تو سقراط نے اس سے کہا "ماؤس! یہ حسین ہے جب اس کی تخلیق ہو رہی تھی اسوقت بھی اس میں حسن تھا۔ لیکن ماؤس "حسین" کہتے کسے ہیں، اس کے معنی کیا ہیں"؟

"حسین"؟ ماؤس نے کہا اور تھوڑی دیر تک حیرت میں رہا اور پھر اس نے برتن کی گردن پر ہاتھ رکھ کر کہا (جو اس نے ابھی بنایا تھا) "میرا خیال ہے یہ حسین ہے اور وہ بھی حسین ہے وہ جو وہاں رکھا ہے لیکن جس برتن کو تم نے مجھے کل بناتے دیکھا تھا وہ حسین نہیں تھا۔ وہ مجھ سے خراب ہو گیا تھا۔ اگرچہ بہت سے لوگوں سے اس کا نقص مخفی رہے گا"۔

سقراط نے بھی اس برتن کے خم کو محسوس کرنے کے لئے اس پر ہاتھ رکھ دیا لیکن ظاہر تھا کہ اسے جواب سے تشفی نہیں ہوئی۔ "نہیں ماؤس! یوں نہیں۔ لوگ ہمیشہ یہی کرتے ہیں۔ وہ چیزوں کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ حسین ہے وہ حسین ہے اور چیزیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ حسین برتن حسین کشتی، حسین ہمت، سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لیکن اس سب میں قدرِ مشترک کیا ہے۔ ان میں کوئی یکسانیت تو ہوگی۔ میں یہ نہیں جاننا چاہتا کہ یہ چیز حسین ہے اور وہ بھی حسین ہے۔ ماؤس! میں تو جاننا چاہتا ہوں کہ "حسین" بجائے خود کیا ہے۔ تم حسین چیزیں بناتے ہو تم کو تو معلوم ہونا چاہیئے"۔

یہ بات میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ اگرچہ خود میں نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا تھا۔ ماؤس بھی اس کی بات سمجھ گیا۔ لیکن صحیح جواب نہیں دے سکا آخرکار اس نے کہا۔ "سقراط! مجھے نہیں معلوم کہ "حسین" کیا ہے۔ میں تو صرف اچھے برتنوں کے بارے میں جانتا ہوں۔ میرے نزدیک ایک اچھا برتن حسین برتن ہوتا ہے"۔

"لیکن ماؤس! وہ اچھا کیوں ہوتا ہے؟" سقراط نے اس سے سوال کیا۔ "اس صراحی کو دیکھو" ماؤس نے دوبارہ اشارہ کیا اس سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ سقراط کے اعتراض کو بھول گیا ہے۔ "اچھی صراحی ہے۔ وہ کسی نہ کسی مقصد کے لئے اچھی ہے۔ اس سے انڈیلنے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ اس کے دہانے کے خم کو اور گہرا کر دو تو شراب بہنے لگے گی۔ نچلے حصے کا حجم بڑھا دو تو بڑی جلدی

تو جھک کر گر پڑے گی۔ اس صورت میں یہ صراحی اچھی نہ رہے گی۔ جو لوگ واقف کار ہیں پھر وہ اسے ''حسین'' کہہ کر نہ پکاریں گے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جس کام کے لئے یہ بنائی گئی ہے اگر وہی نہ کر سکے تو یہ صراحی کہنے کے قابل ہی نہیں۔ ایسی حالت میں تو مٹی کا لونڈا ہے اور بس۔'' سقراط نے آہستہ سے کہا۔ ''تو پھر اس کے معنی یہ ہوئے کہ چیز اچھی ہو تو حسین کارآمد ہوتی ہے تو اچھائی ہی سے چیز کچھ بنتی ہے''

ماؤس نے گردن ہلائی ''میں بھی یہی سمجھتا ہوں اور میرا خیال ہے جو شخص بھی صراحیاں بناتا ہے وہ اچھی ہی صراحیاں بنانا چاہے گا''۔

''تو پھر سب اچھی صراحیاں کیوں نہیں بناتے''؟ سقراط نے پوچھا۔

''انہیں اچھی صراحیاں بنانے کا طریقہ نہیں معلوم'' ماؤس نے جواب دیا۔ ''حقیقت میں انہیں یہی نہیں معلوم کہ اچھی صراحی ہوتی کیسی ہے۔ ایسی صراحی جسے سچ مچ صراحی کہا جا سکے۔''

''اگر دوسروں کو صحیح نمونہ یا نقشہ معلوم ہو جائے تو وہ بھی ایسی ہی صراحیاں بنانے لگیں سقراط نے کہا ''لیکن ماؤس! یہ نمونہ یا نقشہ بنایا کس نے''؟

''میں نے نہ میرے باپ نے، برتن بنانے والے مدتوں سے یہی کام کر رہے ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ ابھی تک نمونے یا نقشے میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ شاید اصلی نمونہ تو ابھی تک نہیں بن سکا۔ آہستہ آہستہ ہم اصلی نمونے کے قریب آ رہے ہیں۔ شاید آ چکے ہیں'' ''لیکن یہ نمونہ یا نقشہ تمہارے ذہن میں

آتا کس طرح ہے؟" سقراط نے پوچھا۔ "ماؤس! میں یہ نہیں جانتا ہوں کہ کیسے؟"

یہ آخری سوال تھا کہ بوڑھے کو اس کا جواب دینے میں خاصی دیر لگی۔ آخر کار اس نے کہا" سقراط! میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن پہلے ضروری ہے کہ تم صراحیوں کے متعلق معلومات حاصل کرو۔ صرف یہی نہیں کہ وہ کیسی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ بات تو ہر گاہک دیکھ سکتا ہے۔ تمہیں تو یہ جاننا ہے کہ ان میں کون سی بات ہوتی ہے جو انہیں اچھی اور اصلی صراحیاں بنا دیتی ہے۔ جس کی بنا پر وہ اپنا کام سر انجام دے سکتی ہیں۔ سقراط! جاننا یا علم حاصل کرنا بہت اہم ہے"۔ اس کے بعد تو گویا ماؤس کی دوکان میں اس دوپہر کو گیند اچھالنے اور کھیلنے کا کھیل ہوتا رہا۔ آخر میں نے محسوس کیا کہ اس کھیل کے رموز سے آگاہ ہونا میرے بس کا روگ نہیں ہے ہاں اب اس فن کے متعلق میری معلومات اچھی ہیں۔ شاید اس وقت فن کی رمز سقراط کی سمجھ سے بھی بالاتر تھی۔ ماؤس بہر حال ایک کمہار تھا اور وہ برتنوں کی باتیں کرتا تھا۔ اس دن اگر ماؤس نے یہ کہا کہ اچھائی کا کوئی مثالی نمونہ یا نقشہ ہوتا ہے اور ہمیں اس کی جستجو کرنی چاہیے تو وہ گویا اس نے ضمناً کہا تھا۔ اس کے باوصف میں سمجھتا ہوں کہ اس دن سقراط سے ماؤس کی گفتگو جو ہوئی تو سقراط کی زندگی میں ایک اہم اور معنی خیز بات کی گویا ابتدا ہوئی سقراط نے جو کام کیا ہے اس کا نقطہ آغاز اسی گفتگو کو فرض کر لیا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

سنگتراش کی شاگردی

کراٹو کا یہ خیال شاید ٹھیک تھا کہ سقراط اسی وقت سے جب وہ بچہ تھا اور اسکول میں پڑھتا تھا، ایک فلسفی کی طرح سوچنے اور چیزوں کے معنی تلاش کرنے لگا تھا۔ وہ آگے چل کر اسی عمر کے بچوں کو سوچنے میں مدد دیتا تھا۔ اس لئے کہ اس کے خیال میں یہ عمر سوچنے کے لئے فطرتاً موزوں تھی۔ ممکن ہے کہ سقراط کے اس فکری رجحان کی ابتدا اسکول کے بعد ہوئی ہو۔ اس لئے کہ جب اس کے باپ نے اسے اسکول سے اٹھالیا تو اس کی عمر تیرہ چودہ برس سے زیادہ نہیں تھی۔

سقراط کو اسکول چھوڑنے کا ذرا بھی رنج نہیں تھا۔ مدرسہ کی زندگی میں اس نے بعض ایسی باتیں سیکھی تھیں خصوصاً پرانے سورماؤں کے گیت جنھیں آخر عمر تک اس کا ہمدم و دمساز رہنا تھا اور یہ فائدہ بھی اسے حاصل ہو گیا تھا کہ اس نے کشتی لڑنے، دوڑنے اور ورزش گاہ کے کھیلوں کی تربیت حاصل کر لی تھی۔ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس تربیت کی بدولت ایک معمولی قسم کا کھلاڑی بھی نہیں بن سکا لیکن یہ چیزیں آگے چل کر اس کے لئے مفید چیزیں ثابت ہوئیں۔ سقراط کے علم حاصل کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ یہ دولت صرف استادوں اور معلموں ہی

سے نہیں بلکہ جس سے اور جہاں سے بھی ممکن ہو حاصل کرتا تھا۔ اس طرح کی تعلیم ظاہر ہے کہ اسکول ہو یہ نہ ہو ہمیشہ جاری رہتی ہے۔

اس کے علاوہ سقراط چونکہ سنگ تراش کا لڑکا تھا۔ اس لئے اب اسے اپنے باپ کا پیشہ سیکھنا تھا۔ (داستانوں میں یہی مذکور ہے اور یہی قرین قیاس بھی معلوم ہوتا ہے)

سوفرونس کس نے سنگ تراشی میں خوب پیسہ کمایا تھا اس لئے سقراط کو بھی امید تھی کہ وہ اس پیشہ میں نمایاں کامیابی حاصل کرے گا۔ تربیت یافتہ کاریگر کے لئے کام کی بڑی گنجائش تھی۔ رفاہ عامہ کے مدنظر، عمارتیں زیر تکمیل تھیں۔ وہ دیوار جو ایتھنز کو سمندر سے ملاتی تھی تکمیل ہو چکی تھی اب سنگ تراش کا مستند ورچیش تھا۔ پھر ان مہارت سے تراشے ہوئے کتبوں کا کام تھا جن پر قوانین ثبت کرنے مقصود تھے یا ملی اور قومی دستاویزات (سقراط نے دوسری نوعیت کا کام زیادہ کیا اس لئے کہ ایتھنز کے روز افزوں جمہوری رجحانات اپنے کارناموں کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا چاہتے تھے) پھر ان کے علاوہ بھی بھی بہت تھے۔ مثلاً سنگ مزار وغیرہ۔ سوفرونس کس کا بیشتر وقت گھر سے باہر دوسرے کاریگروں کے ساتھ گزرتا تھا۔ اس طرح سقراط کو لوگوں سے ملنے جلنے کا موقع ملتا رہتا تھا اور اس بات میں اسے لطف محسوس ہوتا تھا۔ لیکن گھر کے صحن میں بھی جب اس کا باپ چھوٹے موٹے کام کرتا تھا تو وہ اس کا ہاتھ بٹاتا تھا۔

سوفرونس کس نفیس اور نازک کاموں کے لئے پونٹی لیکوس کے پہاڑوں کا دودھیا، سفید، چکنا اور نفیس سنگ مرمر استعمال کرتا تھا۔ اس کے اوزار وہی

تھے جو اس کے باپ دادا استعمال کرتے چلے آئے تھے۔ وہی ہتھوڑے جن سے پتھر توڑنے کا سخت کام کیا جاتا تھا۔ وہی نکیلی یا چوکور میخیں جن پر ہتھوڑوں کی چوٹ لگائی جاتی تھی اور وہی دندانے دار یا خم دار تیشے جن سے پتھر کی سطح ہموار کی جاتی تھی اور وہی برمے جن سے پتھر میں سوراخ کئے جاتے۔ سقراط نے اپنے باپ کو یہ اوزار سینکڑوں مرتبہ استعمال کرتے دیکھا تھا۔ اب وہ خود انہیں استعمال کرنے لگا تھا۔ وہ انہیں تیز کرتا تھا اور ان میں سے ہر ایک کے استعمال میں مہارت حاصل کرتا تھا۔

خاصے عرصے سقراط صرف تراش خراش کے ابتدائی کام کرتا رہا۔ ابتدائی مشق کے لئے سنگ مرمر جیسی قیمتی چیز کو ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سطح کے ہموار ہو جانے کے بعد جب اصل کام شروع ہو جاتا تو سقراط کا باپ خود کام کرنے لگتا اور سقراط ایک ایک کر کے اسے اوزار دیتا رہتا اور کام کو غور سے دیکھتا رہتا۔

مثلاً ایک مرتبہ ایک فوارے کے منہ کے لئے ایک شیر کا سر بنانا تھا۔ سوفرونس کس نے سنگ مرمر کا ایک گول ٹکڑا لیا اور اس پر کام شروع کیا۔ وہ ایک وقت میں آدھے آدھے انچ کے حصوں پر کام کرتا اور حسب ضرورت ایک کے بعد دوسرا نازک تر اوزار سنبھال لیتا۔ اس نے چوکور، نکیلی اور تیز میخوں سے کام لیا اور دندانے دار تیشے سے بھی۔ رفتہ رفتہ سر کے خطوط اور اس کی تفصیلات کی نمود کی باری آئی۔ پہلے منہ بنا، اس پر چپٹی ناک اس کے بعد خوفناک آنکھیں اور سب سے آخر میں پریشان بالوں والی ایال۔ سقراط کی نظر ان سب نازک خطوط پر تھی۔ وہ اب اس فن کی باریکیوں کو سمجھنے لگا تھا۔ اس کے باپ نے برسوں کی

ریاضت سے یہ مہارت اور اوزاروں کے استعمال پر یہ قدرت حاصل کی تھی۔ لیکن جب سقراط نے اس سے پوچھا کہ آپ کو یہ اندازہ کسطرح ہوتا ہے کہ تیشہ کہاں کہاں رکھیں اور اس پر کتنی سخت چوٹ لگائیں۔ تو وہ انتہائی کوشش کے باوجود تشریح نہیں دے سکا۔ اس نے کہا یوں سمجھو کہ سب سے پہلے تمہیں شیر پتھر میں دیکھنا پڑتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ شیر سطح کے نیچے قید ہے۔ وہ تمہارا منتظر ہے اور تمہیں اسے آزاد کرنا ہے۔ اب جتنی اچھی طرح تم شیر کو دیکھ سکو اتنے ہی یقین کے ساتھ تمہیں یہ بات معلوم ہوگی کہ تمہیں تیشہ کہاں رکھنا چاہیے اور کتنی سخت چوٹ لگانی چاہیے۔ اس کے بعد کی منزل مشق اور تربیت کی منزل ہے۔

سقراط نے اپنے باپ کی اس بات پر غور کیا اور اس موقع پر اسے اپنی ماں کی کہی ہوئی ایک بات یاد آئی۔ قرب و جوار میں وہ دائی کے کام میں بہت ہی ماہر سمجھی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ سقراط نے اس سے پوچھا "ماں تم یہ کام کس طرح کر لیتی ہو"۔ اس نے جواب دیا "میں خود کچھ بھی نہیں کرتی۔ میں تو بچہ کے آزاد ہونے میں معاون ہوتی ہوں"۔

سقراط نے سوچا کہ یہی تو اس دن ماؤس کے کارخانہ میں ہوا تھا۔ ماؤس نے نقشوں یا معیاری نمونوں کا کوئی واضح تصور سقراط کے ذہن نشین نہیں کیا تھا۔ وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے اور اسی سوال جواب سے سقراط کے دل کے میں ناگہاں ایک خیال جیسے بجلی کی طرح کوند گیا۔ سقراط نے اندازہ کیا کہ یہ خیال اس کے ذہن میں پہلے سے مقید یا موجود تھا۔ اگرچہ سقراط کو اس

کی موجودگی کا علم نہیں تھا۔ ماؤس نے اس مقید خیال کو آزاد ہونے اور واضح شکل میں سامنے آنے میں مدد دی۔

سقراط کے دل میں یہ خیال کیا پیدا ہوا گویا امنگوں اور ولولوں کی لہریں اٹھنے لگیں۔ کسے معلوم کہ کتنے خیالات اسی طرح ذہن میں مقید ہیں اور آزاد ہونے کے منتظر ہیں۔ اگر انسان صحیح طریقے پر سوال کرنا سیکھ لے تو انہیں آزادی دلا سکتا ہے۔ اعیان یا خیالات کی نوعیت دوسری ہے۔ سقراط ہمیشہ نئے خیالات و اعیان کی جستجو میں رہتا اور انہیں دریافت کرتا رہتا تھا لیکن پتھر کی سطح کے نیچے شیر یا کسی دوسری مخلوق کو مقید دیکھنا اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ ابھی سقراط کو کام کرتے ایک سال سے زیادہ نہیں ہوا تھا کہ اس کے باپ نے اندازہ کر لیا کہ اس میں اچھا سنگ تراش بننے کی صلاحیت نہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ کمزور یا کاہل تھا۔ وہ تو ضرورت سے زیادہ قوت اور طاقت رکھتا تھا۔ ڈر یہ تھا کہ اس کے ہتھوڑے کی ضرب سے پتھر چور چور نہ ہو جائے۔ اس کی انگلیاں اس کے ماں باپ کی انگلیوں کی طرح طبعاً محتاط اور حساس نہیں تھیں۔ سقراط کی مہارت انسان سے متعلق تھی، پتھر سے نہیں۔

سقراط کو خود یہ بات معلوم تھی حالانکہ وہ یہ بات کسی سے کہتا نہ تھا۔ اس زمانہ میں کسی کے ذہن میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ وہ اپنا آبائی پیشہ ترک کر دے۔ آدمی کی تربیت ہی اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ آبائی پیشہ ہی اختیار کرے

اور وہ کس ...

سقراط کو ان لوگوں سے مل کر جو اس کے باپ کے پاس آتے تھے یا

شہر جا کر، خوشی محسوس ہوتی تھی۔ وہ تو یہی چاہتا تھا کہ باہر نکل کر دیکھے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ سقراط کی ذہنی حالت کا سراغ لگانے کے لئے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ ہم اس کے والد کی دوکان کو چشم تصور سے دیکھیں بلکہ اس شہر کو بھی نظر میں رکھنا ضروری ہے جہاں وہ رہتا تھا۔ ہمارے ذہن میں بڑے شہروں کا جو تصور ہے ایتھنز ویسا نہیں تھا۔ سقراط اس شہر کے اکثر لوگوں سے براہ راست یا بالواسطہ واقف تھا۔ یہ بہت دلچسپ شہر تھا۔ جس زمانہ میں سقراط وہاں رہتا تھا ایتھنز میں اتنے تجربے ہو رہے تھے، اتنے اہم خیالات اور تصوارت کی چھان پھٹک ہو رہی تھی اور اتنی خوبصورت چیزیں بن رہی تھی کہ دنیا کی تاریخ میں شاید ہی کوئی شہر اس کی مثال پیش کر سکے۔

ایتھنز سے کسی قدر بلندی پر ایک پہاڑی تھی جسے شہر کی چھت کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ یہ پہاڑی ہر ایک کی نظر اور خیال کا مرکز تھی اور اسے بیک وقت ایک قلعے اور مقدس مقام کی حیثیت حاصل تھی۔ ایتھنز کا ہر بچہ جانتا تھا کہ یہاں سمندر کے دیوتا پوسائی ڈون اور دیوی ایتھنا کا مقابلہ ہوا تھا۔ شہر کی سرپرستی کا مقام حاصل کرنے کے لئے دونوں تحائف پیش کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ پوسائی ڈون نے تحفہ میں جنگی گھوڑا دیا تھا۔ اس نے پہاڑ پر اپنا دوشاخہ عصا مارا تو وہاں ایک چشمہ ابل پڑا۔ وہ چشمہ اب تک وہاں موجود تھا اگرچہ اب اس کا پانی سمندر کے پانی کی طرح نمکین تھا اور ایتھنا کے دیے ہوئے تحفے یعنی زیتون کے اس مقدس درخت کی برابری نہیں کر سکتا تھا جو اس چشمے کے پاس لہلہاتا ہے۔

ایتھنز شہر کی دیوی اور ملکہ ہو گئی اور خاصے طویل عرصے تک ایتھنز زیتون ہی کے سہارے زندہ رہا۔ شہر کے چاروں طرف کے میدان زیتون کے سرسبز و شاداب باغوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ایتھنز کے لوگ زیتون کا تیل برآمد کرتے تھے۔ کھیلوں میں انعام کے طور پر دیتے تھے۔ نہانے دھونے کے کام میں لاتے تھے۔ اس سے کھانا پکاتے تھے اور چراغ بھی جلاتے تھے۔ ایتھنز کے نوجوان ورزش گاہ جاتے تھے تو جسم پر مالش کرنے کے لئے تیل کی ایک بوتل ان کے کندھے پر لٹکی رہتی تھی اور سوفر ونس کس جیسے کاریگروں کے لئے تو مٹھی بھر زیتون دوپہر کے کھانے کا لازمی جزو شمار کیے جاتے تھے۔

سقراط کے پیدا ہونے سے تقریباً دس سال پہلے چار سو اسی قبل مسیح میں اہل فارس نے جب ایتھنز پر حملہ کیا تو ایتھنا ایکروپولس کو جلا کے خاک کر دیا۔ سقراط نے آغاز شباب میں اس شہر کے وہ ستون دیکھے تھے جن میں دھواں جم گیا تھا۔ جب اس کی عمر بیس سال سے کچھ زیادہ تھی تو ایتھنز کے عظیم الشان تعمیری منصوبے پر عمل کیا گیا اور سنگ مرمر کے وہ فلک بوس، ہیکل اور معابد بننا شروع ہوئے جن کی اب تک ساری دنیا میں شہرت ہے۔

جس آدمی نے عمارات کا یہ منصوبہ تیار کیا تھا۔ اسکا نام فارقلیس (پیریکلیز) تھا۔ اور وہ ایتھنز کے سیاسی راہ نماؤں کی صف اول میں تھا۔ جزیرے کے شہریوں اور مشرقی کنارے کے ساکنوں نے کچھ رقم جمع کی تھی تاکہ ایرانیوں کے حملے کا جواب دیا جا سکے۔ فارقلیس یہ رقم مندروں کی تعمیر پر صرف کرنا چاہتا تھا۔

آغاز کار میں ایتھنز دفاعی تنظیم کا رہنما تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ ایک منظم بحری سلطنت کا مرکزی شہر بنتا جا رہا تھا۔ پورا یونان عموماً اور پیلو پونی سس جنوبی جزیرہ نما خصوصاً اپنے اس ہمسایہ کو حسد اور خوف کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ سپاہیوں کا شہر اسپارٹا بھی ایتھنز کہ اس بڑھتی ہوئی قوت کو دائماً برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

حسد اور خوف سے فساد رونما ہوتا ہے اور مستقبل میں اس فساد کو ایک خوفناک جنگ میں تبدیل ہونا تھا۔ لیکن نوجوان سقراط کے دل میں ایتھنز کی اس بڑھتی ہوئی قوت سے خوف کے بجائے جوش اور ولولہ پیدا ہوتا تھا۔ ایتھنز کے شہریوں کی مجلس میں جو بازار کے قریب ایک پہاڑی پر منعقد ہوا کرتی تھی۔ صقلیہ، مصر، ایشیائے کوچک اور بحیرہ اسود کے مسائل پر بحث ہوا کرتی تھی۔ سقراط اور اس کے دوستوں کو ان دنوں دور دراز مقامات کے لوگوں کی دلکش صورتیں دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ ان میں آہستہ آہستہ چلنے والے وہ مغرور ایرانی بھی شامل تھے جن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ سچ بولنے کو ہر بات پر ترجیح دیتے تھے اور جزائر کے وہ ملاح بھی جو جنوبی روس کی بندرگاہوں سے اسی طرح واقف تھے جس طرح اپنی بندگاہوں سے اور نیل کے بیسیوں سفر کر چکے تھے۔ بحیرہ روم کے تمام علاقوں کے فنکار اور دیگر ایتھنز میں آتے تھے۔ وہ لوگ ان کے علاوہ تھے جنہیں خود ایتھنز کی سرزمین نے جنم دیا تھا۔ شاعر، موسیقار، انجینئر اور معمار، تاجر، سفیر اور جلا وطن روساء، ایتھنز میں ہر قسم کے لوگ آتے تھے۔ اس لئے دنیا کے دلچسپ ترین لوگوں کا مطالعہ کرنے کے لئے سقراط کو

اپنے شہر سے باہر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔

ان حالات میں یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کہ سقراط نے جس کا تخیل آمادہ پرواز تھا اور جسے تجسس کی عادت تھی، اپنا مشغلہ ہی یہ بنا لیا تھا کہ لوگوں کی باتیں سنے اور سوال پر سوال کرتا چلا جائے۔ ایتھنز کا ہر شخص باتوں کا شوقین تھا۔ لوگ صبح کے وقت بازار میں، دوپہر کے وقت ورزش گاہ میں اور شام کو دعوتوں اور تفریحی محفلوں میں باتیں کرتے۔ کھیل سیاست، جنگ و امن ان کا موضوع ہوتے۔ مثلاً تمہارے خیال میں اس سال اولمپک مقابلوں میں کشتی کون جیتے گا؟ کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ فارقلیس کی جیوری کو معاوضہ دینے کی تجویز تباہی کا باعث بنے گی؟ مصر سے ہمارے بحری بیڑے کی کوئی خبر کیوں نہیں آئی؟ وہ اپنی حکومت کو جو دنیا کی پہلی جمہوریت تھی، باتوں ہی سے چلاتے تھے۔ ہر مرد شہری کو مجلس میں ووٹنگ سے پہلے اظہار خیال کا حق تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اگر وہ اچھا مقرر نہ ہوتا تو لوگ اسے شور مچا کر بٹھا دیتے۔

اس طرح سقراط کو بہت سی باتیں سننے کا موقع ملا۔ وہ سنتا اور جو کچھ سنتا اس پر غور کرتا اور پھر اپنے ذہن میں خیالات کو مرتب کرتا۔ غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ لوگ جن مسائل کے متعلق گفتگو کرتے ہیں عموماً انہیں کے متعلق ان کی معلومات بہت ناقص ہوتی ہیں۔ یہ بات اس سے ظاہر تھی کہ وہ باتوں ہی باتوں میں خود اپنی تردید کرتے رہتے تھے اور ان کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔ سقراط کو اس بات پر بہت افسوس ہوتا تھا کہ لوگ مسائل پر غور و فکر نہیں کرتے تھے۔ بس باتیں کرتے چلے جاتے تھے۔

جب سقراط کی عمر زیادہ ہوئی اور وہ بھی باتوں میں حصہ لینے لگا تو لوگوں نے محسوس کیا کہ اس کی گفتگو کا مخصوص انداز تھا۔ وہ لگاتار ایک کے بعد دوسرا سوال کرتا چلا جاتا یہاں تک کہ مخاطب کی ذہنی الجھنیں نمایاں ہو کر نظر آ جاتیں۔ یہ بات اس شخص کے لئے پریشان کن ہوتی تھی جس سے سوال کئے جاتے تھے لیکن سننے والوں کو لطف آتا تھا۔ بہت سے لوگ سقراط کے اسلوب استفسار کو ایک پریشان کن کھیل سمجھتے تھے۔ جس میں شعبدہ گری کا سا رنگ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ شروع میں ایسا ہی ہو۔

لیکن ایتھنز کی زندگی میں صرف باتیں ہی باتیں نہیں تھیں۔ سقراط کے اپنے ہم عمر دوست بھی تھے۔ جنکا معمول وہی تھا جو سقراط کا تھا۔ سقراط کے یہ نوجوان پڑوسی اس طرح سنگ تراشی یا بڑھئی کا کام سیکھ رہے تھے۔ وہ کام کے اوقات کے بعد یا گرمیوں کی دوپہر میں جب بڑے آدمی محو خواب ہوتے، سڑکوں پر کھیلتے پھرتے۔ ایتھنز کے دوسرے لڑکوں کی طرح سقراط کے دوست بھی دوسرے محلوں کے لڑکوں کے ساتھ دوڑتے۔ کشتی لڑتے اور کھیلتے کودتے تھے۔ وہ ہڈیوں کا پانسا پھینکتے۔ وہ کھیل کود کے لئے اپنی ٹولیاں بناتے۔ دوستی کے گہرے رشتے قائم کرتے اور توڑ دیتے۔ سقراط بھی ان ٹولیوں میں شامل ہوتا۔ آگے چل کر جب اس کے یہ ساتھی ماہر کاریگر بن گئے اور سقراط نے اپنے لئے ایک دوسرا مشغلہ تلاش کر لیا تو شہر کے ہر کارخانے میں اس کا خیر مقدم ہوتا تھا۔

سقراط اپنے اسکول کے ان ساتھیوں سے کم ملتا تھا جو شرفا کے لڑکے

تھے اور جو کسی اور پیشہ میں داخل ہونے کے بجائے سیاست میں الجھنے والے تھے اور قومی خدمت کو نصب العین بنانے والے تھے۔ اب وہ صرف تہواروں اور تقریبوں پر ان سے ملتا جلتا تھا۔

وہ سب ایتھینا کے محترم تہوار پر ایک ساتھ جلوس میں شامل ہو کر پہاڑ پر جاتے تھے اور کشتیوں کی دوڑ، مشعلوں کی دوڑ، کھیلوں کے مقابلے اور فوجی مظاہرے دیکھتے تھے۔ مشاہیر کے المیے اور ہنسی مذاق سے بھرپور طربیے بھی مل کر دیکھتے تھے۔ ایسے المیے اور طربیے جن کی تخلیق میں ایتھنز کے بہترین مفکروں کی حکمت، تخیل اور بذلہ سنجی شامل رہی تھی۔ (ہر تہوار پر پندرہ کھیل دکھائے جاتے تھے)

اس طرح تہوار کے موقعوں پر پورا ایتھنز ایک ہو جاتا۔ سنگ تراش سقراط اور رئیس کھلاڑی کراٹو میں کوئی فرق باقی نہ رہتا۔ لیکن دوسرے دنوں میں اسے اگر ان دوستوں سے ملنا ہوتا تو اسے ورزش گاہ جانا پڑتا۔ اسکول میں طلباء ورزش کرتے تھے اور کھیل کود میں شریک ہوتے تھے لیکن یہ آغاز کار تھا۔ آخر مہارت پیدا کرنے کے لئے وہ ورزش گاہ جاتے اور دن بھر وہیں رہتے تھے۔ اب یہ طلباء زیادہ تر گھوڑوں کی باتیں کرتے تھے۔ ان کی دوستی کا حلقہ بھی اب محدود ہو گیا تھا۔ اور اس طرح سقراط ان سے چھوٹ گیا۔

لیکن اس علیحدگی کے باوجود وہ ان کے کھیل دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ جب وہ گھوڑا دوڑ کے میدان میں بدن پر تیل کی مالش کر کے فراٹے بھرتے ہوئے نکلے چلے جاتے تو ان کے چمکتے ہوئے بھورے جسم دھوپ میں

بڑے حسین معلوم ہوتے تھے۔ یا جب وہ دلپذیر توازن اور نفاست کے ساتھ دھات کا طشت گھما کر بیٹھتے تھے تو ان کی مہارت اور مسلسل مشاقی کا سراغ ملتا تھا۔ یہ لوگ بھی ماؤس اور فروبنس کس کی طرح اپنے اپنے فن میں ماہر تھے۔ ان کی مہارت سقراط کے لئے کاریگر کی ہنرمندی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ لیکن اسے حسین اور زندہ شے کی طرح ان چیزوں سے بھی محبت تھی۔

دیوتا

کارخانے کا کام شہریوں کی باتیں، گلیوں میں کھیل کود میلے ٹھیلے اور سیر تماشے۔ ان سب چیزوں میں سقراط بھی اسی طرح شریک ہوتا تھا جیسے اس کے دوسرے ہم سن۔ اب سب چیزوں کے متعلق اس کے جذبات بھی انہیں کے سے تھے۔ لیکن عمر کے ساتھ ساتھ تو اس میں اور اس کے ساتھیوں میں اختلاف نمایاں ہوتا چلا گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ اختلاف شروع کب ہوا۔

ظاہر ہے کہ یہ اختلاف اس سے بہت پہلے شروع ہو چکا ہوگا جب لوگوں کو اس کا شعور حاصل ہوا۔ لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ وہ اپنے دوستوں کی نسبت مختلف چیزوں اور خاص طور سے تصورات کے متعلق علم حاصل کرنے کا زیادہ خواہش مند ہے۔ انہوں نے یہ اندازہ بھی کر لیا ہوگا کہ اس کا انداز فکر دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ مکمل تھا۔ فضا میں اڑتے ہوئے پرندوں کی طرح بکھرے ہوئے خیالات اسے تسکین نہ دے سکتے تھے۔ وہ متفرق اور منتشر تصورات میں ربط پیدا کر کے انہیں ایک ہی خاص سمت میں لے جانے کا خواہاں تھا۔ کچھ لوگ یہ نکتہ جان گئے ہوں گے لیکن شاید ایک طویل مدت تک کسی نے اس عجیب و غریب اختلاف کو محسوس نہیں کیا جو سقراط اور اس کے ہم عصر کے دوسرے

لوگوں کے درمیان دیوتاؤں کے سلسلے میں پیدا ہو گیا تھا۔

شروع شروع میں جب سقراط نے دیوتاؤں کے متعلق لوگوں سے سوالات کرنا اور خود سوچنا شروع کیا تو اسے معلوم ہوا کہ اسے کتنے ہی ملے جلے تصورات کو سلجھانا ہے۔ مثال کے طور پر اس کا دوست ماؤس جو شہر کا بہترین کاریگر تھا۔ وہ خوبصورت سادہ اور سڈول گگریاں اور برتن بناتا تھا۔ اس کے اندازے بالکل صحیح تھے اور اس کا معیار واضح۔ اس لئے اس کے ذہن میں مجوزہ نقشے کا کوئی جزو کسی دوسرے جزو سے نہیں ٹکراتا تھا۔ لیکن جب وہ دیوتاؤں کے متعلق سوچتا تو معلوم ہوتا تھا کہ پیش نظر کوئی معیار ہی نہیں۔ اس سلسلے میں اس کے تصورات اور افکار کا نظام غیر مربوط تھا۔

جب سقراط بڑا ہوا اور اس نے اپنی معلومات کا دائرہ بڑھانا شروع کیا تو اسے معلوم ہوا کہ عموماً انسان کے ذہن میں دیوتاؤں کے متعلق الجھنیں سی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کبھی ذہن میں، تصورات تہ درتہ جمع ہو گئے ہیں لیکن کسی معیار کو ملحوظ رکھ کر تصورات کی گتھیاں سلجھائی نہیں گئیں اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ بہت ہی کم لوگ تھے جنہیں اس الجھن کا احساس تھا یا جو اس الجھن کو دور کرنے کی بھی کوشش کرتے تھے۔

جب سقراط لوگوں سے دیوتاؤں کے متعلق سوالات کرتا تھا تو وہ جواب میں اسے مختلف قسم کی اچھی یا بری کہانیاں سنا دیتے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ قدیم زمانے میں دیوتا آدمیوں کے معاملات میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ جو لوگ ان کے منظور نظر ہوتے ان کی وہ مدد کرتے تھے۔ مثال کے طور پر اوڈی

سیس کا واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ جب کبھی وہ مصیبت میں مبتلا ہوتا تھا تو منقل مند دیوی ایتھینا کبھی چھپ کر اور کبھی ایک دراز قامت خوب صورت عورت کے روپ میں اور کبھی ایسی دیوی بن کر جس کی بھوری بھوری دلکش آنکھیں خوب روشن تھیں اور جس کی ڈھال کے کناروں پر سانپ لہراتے تھے۔ اس کی مدد کرتی تھی۔ وہ جہاں بھی ہوتی اس کی فریاد سن کر اس کی مدد کو پہنچتی۔ اگرچہ بعض اوقات وہ مصروف ہوتی تھی یا اوڈی سیس کے مخالف دیوتا اسے مدد کرنے سے باز رکھتے تھے۔ ایسی حالت میں اوڈی سیس کو اکیلے ہی آفتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ جب تک وہ اس کی مدد کو نہ آ جائے (اور سچ یہ ہے کہ وہ خوب ڈٹ کر مقابلہ کرتا تھا)

دیوتاؤں کے دشمن بھی ہوتے تھے جن سے وہ نفرت کرتے تھے اور اس کی وجہ سے سورماؤں کو کبھی کبھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ایک بار اوڈی سیس نے سائی کلوپس کو اندھا کر دیا جو سمندر کے دیوتا پوزائیڈن کا تیز مزاج کانا سپوت تھا۔ اگرچہ اس نے یہ فعل اپنی مدافعت میں کیا تھا لیکن اس نے غلطی یہ کی کہ جوش میں آ کر فخر کے ساتھ اس بات کا ڈھنڈورا پیٹتا پھرا۔

سائیکلوپس نے اپنے باپ سے شکایت کی اور بدلہ لینا چاہا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب کبھی پوزائیڈن اوڈی سیس کو سمندر میں دیکھتا تو وہ ایک طوفان اٹھا دیتا اور اگر اوڈی سیس کو گرفتار نہ کر سکتا تو جہاز کے کپتان اور ملاحوں کو سزا دیتا۔ جن کا قصور صرف یہ تھا کہ انہوں نے اوڈی سیس کو پناہ دی۔ ایک مرتبہ اس نے شاید اوڈی سیس کے جہاز سے اترتے ہی اس کے جہاز کو پتھر میں تبدیل کر دیا۔

جہاز پانی میں بیٹھ گیا اور ایک جزیرہ بن گیا۔ تا کہ لوگ عبرت حاصل کریں کہ پانی کے دیوتا کے دشمنوں کی مدد کرنے والوں کا یہ حشر ہوتا ہے۔

تو لوگ دیوتاؤں کے متعلق یہ خیال کرتے تھے کہ ایک زمانے میں وہ اولمپس پہاڑ پر رہتے تھے جو آسمان پر ہے اور ایسے انسانوں کی طرح تھے جو طاقتور اور مضبوط ارادے والے ہوں۔ پہاڑ پر وہ دعوتیں اڑاتے تھے اور اپنے منظور نظر انسانوں کے لئے آپس میں لڑتے جھگڑتے تھے۔ ہاں کچھ عرصہ سے ان کے متعلق لوگوں کے خیالات میں تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ سمجھنے لگے تھے کہ دیوتا اب ان سے بہت دور ہو گئے ہیں اور اب انسانوں میں ان کا کوئی منظور نظر نہیں رہا۔ اگر چہ کھیلوں میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے کے احسانات کا بیان کرتے وقت لوگ اب بھی یہی کہتے تھے کہ فلاں کھلاڑی پر کسی دیوتا کا سایہ تھا۔

دیوتاؤں کی پرستش کرنے میں بے شک کوئی برائی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ ہر شخص اطمینان قلب سے ان کی پرستش کرتا تھا اور چڑھاوے چڑھاتا تھا اور یہ روز کا ایسا ہی معمول تھا جیسے کوئی شخص کھانا کھالے۔ ہر چھٹی کے موقع پر کسی نہ کسی دیوتا کا جلوس نکلتا تھا۔ اور اس کے لئے قربانی کی جاتی تھی۔ کھیلوں کے مقابلے" ڈراموں کی پیشکش اور موسیقی کے میلے متبرک تہوار گنے جاتے تھے۔ کھانے کے لئے جو جانور پکتا تھا وہ مارا نہیں جاتا تھا بلکہ بھینٹ چڑھایا جاتا تھا۔ جب بچہ پیدا ہوتا یا آدمی بالغ ہوتا یا اس کی شادی ہوتی یا مر جاتا یا لڑائی پر جاتا یا سمندری سفر پر روانہ ہوتا یا اسے کوئی سرکاری عہدہ ملتا تو موقع کی مناسبت سے

قربانی پیش کی جاتی۔ زندگی بسر کرنے کے اس انداز سے سقراط کے خاندان والوں اور اس کے دوستوں کو یہ اطمینان ہوتا تھا کہ دیوتاؤں اور ان کے باہمی تعلقات کافی اچھے ہیں۔ کیونکہ یہ تمام تقریبات اجتماعی ہوتی تھیں۔ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ آدمی ایک کونے میں کھڑا ہو کر عبادت کرے۔ جلوس اور قربانی کے موقع پر عمر کے مطابق ہر شخص کا مرتبہ اور مقام متعین ہوتا تھا اور اس مرتبہ اور مقام کے مطابق اسے کچھ فرائض انجام دینے پڑتے تھے۔ لوگوں کا خیال یہ تھا کہ جو شخص عبادت میں شریک نہیں ہوتا اس کا شہر میں پھر کام ہی کیا ہے۔

اگرچہ دیوتا اب شہر کے دیوتا تھے اور انسانوں میں سے کوئی ان کا منظور نظر نہ ہوتا تھا لیکن سزائیں وہ اب بھی دے سکتے تھے۔ گزشتہ زمانہ میں تو وہ صرف اس شخص کو سزا دیتے تھے جو ان کی ذاتی توہین کرتا تھا لیکن اب وہ اجتماعی نیکی اور راست کاری کی طرف زیادہ متوجہ تھے۔ پھر بھی شخصی عزت کے معاملہ میں وہ اب بھی احساس اور محتاط تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قسم کی اتنی اہمیت تھی کہ اگر کوئی شخص زیوس یا اپولو کی قسم کھا کر کہتا کہ میں یہ کام ضرور کروں گا تو پھر اس معاملے میں متعلقہ دیوتا کی عزت و آبرو کا سوال بھی پیدا ہو جاتا تھا۔

دیوتا قتل سے بہت نفرت کرتے تھے۔ مندر میں قتل کرنا یا گھر کے چولہے کے پاس کسی کو ہلاک کرنا بہت برا فعل سمجھا جاتا تھا کہ گھر کا چولہا بھی قربان گاہ کا کام دیتا تھا۔ اگر کسی نے غلطی سے قتل کر دیا ہو تب بھی خون کے دھبے مشکل سے چھٹتے تھے۔ دیوتا سب سے زیادہ نفرت غرور سے کرتے تھے کہ مغرور شخص اس مقام سے بلند تر ہو جاتا ہے جس کا وہ سزاوار ہے۔

سقراط کے پیدا ہونے سے کوئی دس برس پہلے کا واقعہ لوگوں کو خوب یاد تھا جب خسرو ایران (زرکیسز) نے یونان پر حملہ کیا تھا۔ ایرانی فوج ٹڈی دل کی طرح یونان پر ٹوٹ پڑی۔ سپاہیوں کو پینے کا پانی اتنا درکار تھا کہ دریا خشک ہو گئے اور تیر باراں کی کثرت سے سورج نظروں سے چھپ گیا تھا۔ ایرانی شہنشاہ کو اپنی طاقت پر گھمنڈ تھا۔ اس نے ہلیس پونٹ پر کشتیوں کا ایک پل بنوایا۔ جب طوفان سے پل ٹوٹ گیا تو اس نے پانی کو اس طرح کوڑے لگوائے اور داغ دیا گویا سمندر بھی اس کا نافرمان غلام تھا۔

دیوتا شہنشاہ کے غرور کو نہیں بھولے۔ وہ یہ بھی نہیں بھولے کہ ایتھنز میں اکروپولس کے مندروں کو جلا کر خاک کر دیا گیا تھا۔ سلامیز کے بحیرے میں جب یونانی بیڑے کا ایرانیوں سے مقابلہ ہوا تو دیوتا یونانیوں کے ساتھ تھے اگر ایسا نہ ہوتا تو یونانی فتح کیسے حاصل کر سکتے تھے۔ ایران کا شہنشاہ سمندر کے کنارے زرق برق لباس پہنے اپنے بدرق تخت پر بیٹھا لڑائی دیکھ رہا تھا۔ اس کے واقعہ نویس کھڑے ان سرداران لشکر کے نام لکھ رہے تھے جنہیں اپنے کام کی بنا پر عذاب یا انعام دیا جانے والا تھا۔ ایرانیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ان کو اپنی کامیابی کا یقین تھا پھر بھی انہیں پسپا ہونا پڑا۔ ان کے جہاز ٹوٹ پھوٹ کر ڈوب گئے۔ ان کے جنگجو جنہوں نے شکست کا منہ نہیں دیکھا تھا کچھ ساحل پر قتل ہوئے اور کچھ بحری جنگ میں ہلاک ہوئے۔ خود شہنشاہ کو اپنی سلطنت میں بغاوت کے شعلے فرو کرنے کے لیے یونان سے بھاگنا پڑا۔ اب بھلا کون شک کر سکتا تھا کہ دیوتاؤں نے مغرور حملہ آوروں کو ذلیل کر کے رکھ دیا۔ غرور

دیوتاؤں کی توہین تھی۔

حد سے بڑھتی ہوئی خوش نصیبی اور سعادت بھی خطرناک ہو سکتی ہے۔ سقراط کو ساموس کے پولی کریٹیز کا قصہ سنایا گیا۔ بہت سال پہلے یہ شخص مشرقی جزیروں کا طاقتور حکمران تھا۔ وہ اتنا دولت مند اور ہر لحاظ سے اتنا خوش نصیب تھا کہ فرعون مصر کی نظروں میں بھی بچ گیا اور دونوں میں دوستی کا معاہدہ ہو گیا لیکن فرعون ڈرتا تھا کہ دیوتا پولی کریٹیز کی خوش نصیبی کو اچھا نہیں جانیں گے۔ اس لئے اس نے اپنے دوست کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی سب سے بیش قیمت چیز پھینک دے تاکہ یہ نقصان اٹھا کر دیوتاؤں کے عذاب سے محفوظ رہے۔

پولی کریٹیز نے بھی اسی مشورے پر عمل کرنا مناسب خیال کیا۔ اس نے اپنے تمام خزانوں کو کھنگالا اور ایک بہت قیمتی طلائی انگوٹھی نکالی جس میں زمرد جڑا تھا۔ وہ ایک بڑی کشتی میں بیٹھ کر جو پچاس چپوؤں سے کھیئی جاتی تھی سمندر میں گیا اور انگوٹھی گہرے پانی میں پھینک دی۔ اس کے بعد اس نے سمجھا کہ اب مجھے تکلیف نہ پہنچے گی۔

ایک دن ایک ماہی گیر ایک تازہ مچھلی لے کر آیا۔ اور کہا کہ مچھلی اتنی عمدہ ہے کہ میں اسے کسی معمولی آدمی کے ہاتھ فروخت نہیں کرنا چاہتا بلکہ آپ کی خدمت میں تحفہ کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ پولی کریٹیز اس تحفہ اور تعریف سے بہت خوش ہوا۔ اس نے ماہی گیر کو رات کے کھانے پر مدعو کیا اور حکم دیا کہ مچھلی شاہی باورچی خانہ میں پکائی جائے۔ لیکن جب باورچیوں نے مچھلی کو کاٹا تو یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ان کے آقا نے جو انگوٹھی پانی میں

پھینکی تھی وہ اس مچھلی کے پیٹ میں موجود تھی۔

جب فرعون کو اس انگوٹھی کی واپسی کی اطلاع ملی تو اس نے فوراً ہی پولی کریٹیز سے دوستی کا معاہدہ توڑ دیا۔ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ دیوتا اس آدمی پر سخت عذاب نازل کرنے کی تدبیروں میں مصروف تھے اور ہوا بھی یہی۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد پولی کریٹیز بے دردی سے قتل کر دیا گیا اور اس کی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ دیوتاؤں نے اس کا یہ قصور معاف نہیں کیا تھا کہ وہ بہت خوش نصیب اور کامگار ہے۔

دیوتاؤں کی یہ کہانیاں سقراط نے بچپن میں سنی تھیں۔ پرانے زمانہ میں دیوتا جھگڑتے تھے، جھوٹ بولتے تھے، چوری کرتے تھے اور آدمیوں کے بھیس میں اپنے دوستوں کو بچاتے اور ان کے دشمنوں کو نقصان پہنچاتے تھے۔ اس کے اپنے زمانہ میں دیوتا اگرچہ ویسے نہیں رہے تھے پھر بھی طاقتور تھے اور بدکاری یا غرور یا بہت خوش اقبالی کا جرم معاف نہیں کرتے تھے۔

ان اندوہ ناک کہانیوں کے باوجود تہواروں کے موقع پر جلوس اور قربانیاں اور دعوتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ہر سال اتھینا کے بڑے لکڑی کے بت کو سمندر کے کنارے لے جاتے تھے کہ اسے غسل دیا جائے۔ متبرک سانپ کے لئے مندر میں میٹھی ٹکیا کا چڑھاوا چڑھتا تھا۔ لوگ دیوتاؤں کی قسمیں کھاتے تھے۔ پھر توڑ دیتے تھے اور ان کا کچھ نہیں بگڑتا تھا۔ حالانکہ اس سلسلے میں خوفناک کہانیاں بیان کی جاتی تھیں۔ مناسب موقعوں پر دیوتاؤں کو بھینٹ چڑھانا دانائی اور دنیاداری کا کام سمجھا جاتا تھا۔ ہاں چند لوگ جو بقول کسے "دیوتاؤں

سے بہت ڈرتے تھے" وہ اس سے آگے کی بات بھی سوچتے تھے۔ چرانے اور جھوٹ بولنے سے وہی بڈھے پھونس ڈرتے تھے جن کو یہ خوف تھا کہ دوسری دنیا میں انہیں سزا ملے گی یا دیوتا ان سے بدلہ لیں گے، فیصلہ تو دراصل وہ تھا جو قانونی عدالتوں میں ہوتا تھا۔

یہ تھے دیوتا اور یہ تھا ان کی پرستش کا انداز۔ سوال یہ ہے کہ سقراط کا ان معاملات کے متعلق کیا خیال تھا۔

اس نے شروع ہی میں یہ تو دیکھ لیا تھا کہ اس کے دوستوں پر ان باتوں کا کوئی خاص اثر نہیں تھا۔ دیوتاؤں کے رشک وحسد کی کہانیاں سن کر ان کے جسموں میں ایک جھرجھری سی تو ضرور پیدا ہو جاتی تھی لیکن مالدار اور دولت مند ہونے کے خواب بھی وہ دیکھتے رہتے تھے۔ وہ چوری کرنے اور جھوٹ بولنے کے سلسلہ میں دیوتاؤں کی چالاکیوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ لیکن جب ڈراموں میں گنہگار کو دیوتاؤں کے ہاتھوں سزا پاتے دیکھتے تو وہ واقعی بہت غمگین ہو جاتے تھے۔ وہ کھیل میں بے ایمانی سے بھی کام لیتے اور اطمینان قلب سے پرستش بھی کرتے تھے۔ البتہ سقراط کا مزاج ان سے بالکل مختلف تھا۔ اسے حیرت کا احساس ہوتا تھا اور وہ اپنے ذہن میں ایک چیز اور دوسری چیز میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

ہاں ایک اور فرق بھی تھا۔ لوگ دیوتاؤں کے متعلق جو چاہیں سو کہیں لیکن سقراط ایک عملی معیار کو پیش نظر رکھتا تھا۔ بچپن ہی سے اسے نشان ربانی پر بھروسہ تھا۔

کبھی کبھی سقراط پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی تھی اور یہ کیفیت اسے کوئی کام کرنے سے اس لئے روک دیتی تھی کہ وہ اسے اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ سوال یہ ہے اس لفظ ''اچھا'' کے کیا معنی تھے۔ اچھائی کی حقیقت وہ محسوس تو کرتا تھا۔ لیکن ابتدا میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا کوئی نہ کوئی تعلق مسرت سے ضرور تھا۔ اس کا تجربہ شاہد تھا کہ جب کبھی وہ اس نشان ربانی کے مطابق عمل کرتا تھا تو انجام بخیر ہوتا تھا۔ یوں وہ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ اسے نشان پر بھروسہ کرنا چاہیے اور بغیر کسی تامل کے متعلقہ احکام پر عمل کرنا چاہیے۔ ''نشان ربانی'' ضرور دیوتاؤں کی طرف سے آتا ہوگا کیونکہ انہیں ہر چیز کا علم تھا۔

بڑا ہونے کے بعد بھی سقراط اس نشان کے متعلق زیادہ بات نہیں کرتا تھا بچپن میں تو شاید اس نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ جس طرح لوگ اس کا مطلب بعد میں نہیں سمجھے اسی طرح اس وقت بھی نہ سمجھے تھے یہ بات نہ تھی کہ اس کا خیال ہو کہ اس کے باطن میں کوئی دیوتا مخفی بیٹھا ہے۔ جیسا کچھ لوگوں کا خیال تھا اس نشان سے مراد ضمیر بھی نہ تھا۔ جو یہ کہتا کہ ظلم اور رحم کیا ہے۔ جھوٹ اور حق کیا ہے۔ ان کے درمیان جو فرق ہے اسے وہ ہماری آپ کی طرح محسوس کرتا تھا۔ لیکن یہ اس نے کبھی نہیں کہا کہ نشان ربانی نے اس کی راہنمائی کی ہے۔

نشان ربانی کی بنا پر جن کاموں سے وہ رک جاتا تھا وہ معمولی روزمرہ کے کام ہوتے تھے مثلاً کسی جگہ جانا یا کسی شخص سے بات کرنا۔ کوئی اور شخص ہوتا تو وہ اسے قسمت سے متعلق کر دیتا اور اسے واہمہ کی حد تک پہنچا دیتا مثلاً یہ کہ

درخت پر پاؤں نہ رکھو یا سیڑھی کے نیچے سے نہ گزرو۔ سقراط ''نشان'' سے بالکل مختلف کام لیتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ''نشان'' کے ذریعے وہی طرز عمل اختیار کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے جسے اس کے دل نے درست سمجھا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ دیوتا اسے کسی نیک راستے کی طرف لے جا رہے ہیں اور اس لئے اسے ان کا حکم ماننا چاہیے۔

یہ ایک بالکل معمولی بات تھی لیکن سقراط کو جس بات کا علم تھا وہ گویا اس کے دل نشین ہوتی تھی اس لئے نشان ربانی کے مطابق دیوتاؤں کے متعلق اس کے سوچنے کا طریقہ بھی بالکل بدل گیا اور یہ تبدیلی ایسی تھی کہ اگر وہ اپنے شہر کے لوگوں سے ذکر کرتا تو شاید ہی تھا کہ ان کے پلے کچھ پڑتا۔ اس کے خیال میں پہلی بات تو یہ تھی کہ دیوتا انسانوں کا خیال رکھتے تھے۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ یہ بات سچ ہے۔ اس کا دل اس پر گواہی دیتا تھا کہ دیوتا صرف پرانے بادشاہوں اور سورماؤں کا خیال ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ سقراط بھی ان کے دھیان سے نہیں اترتا تھا حالانکہ وہ بیچارہ سوفرونسکس سنگ تراش کا لڑکا تھا۔

پھر یہ کہ دیوتا اچھے تھے۔ نشان ربانی نے اس معاملے میں بھی اس کے دل کو ایمان سے لبریز کر دیا۔ ان میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو انسانوں میں ہوتی ہیں اور وہ صرف انسانوں کی بھلائی کے خواہاں تھے۔ جھوٹ بولنے اور چوری کرنے والے، حاسد اور غضبناک دیوتاؤں کی پرانی کہانیاں ان لوگوں نے گھڑی تھیں جنہیں کسی بات کی سمجھ نہیں تھی۔ اچھائی میں تو دیوتا کی پہچان تھی اور جو بات اس کے خلاف جاتی تھی وہ محض خیال آرائی ہی خیال آرائی تھی۔

بعد میں ایتھنز میں کچھ اور لوگ بھی اس تصور کے متعلق باتیں کرنے لگے تھے اور کہتے تھے کہ یہ بات سچ ہونی چاہیے لیکن سقراط کو اس کے سچ ہونے پر یقین تھا۔ دیوتا نیک تھے اور جو لوگ ان کی پرستش کرتے تھے ان سے بھی وہ نیکی کے طالب تھے۔ دیوتاؤں پر ایمان لانے کی شناخت یہی تھی کہ وہ نیک ہونے کی شرط پوری کرے۔ سقراط کی زندگی میں کوئی چیز بھی اس ایمان کو نہیں بدل سکتی تھی۔ ایک بار جب وہ ایمان اور یقین کے اس درجے پر پہنچ گیا تو پھر اس کی اعمال و افعال کی وضع ہی بدل گئی۔

بعض اور ایسی تفصیلات بھی تھیں جن کا سقراط کو علم نہیں تھا۔ یا جن کے متعلق وہ سوال ہی نہیں کرتا تھا۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ دیوتاؤں کی شکل و صورت کیسی ہے۔ ان کی تعداد کیا ہے۔ وہ موقع محل کے مطابق کسی ایک دیوتا کی پرستش کر لیتا تھا اور کبھی ''خدا'' یا ''رب'' کے متعلق باتیں کیا کرتا تھا (ایسے موقعوں پر شاید ''خدائے واحد'' یا ''رب اعلیٰ'' مراد لیا جاتا تھا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ یونانی کلمات کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ کبھی خداؤں کا ذکر آ جاتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اچھے دیوتاؤں کی تعظیم و تکریم بہر حال سعادت ہے۔

عام طور سے تو وہ شہر کے رسم و رواج کے مطابق دیوتاؤں کی عبادت اور تعظیم کرتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جو کچھ وہ کرتا تھا اس کے معانی اور اہمیت کے متعلق سوچتا بھی تھا۔ مثال کے طور پر اس کے دوستوں نے دیکھا کہ وہ عام طور پر دیوتاؤں کا نام بے پروایانہ نہیں لیتا تھا۔ جب وہ کسی بات پر بہت زور دینا چاہتا تھا تو دوسروں کی طرح یوں نہیں کہتا تھا کہ زیوس کی قسم۔ بلکہ یوں کہتا

مصر کے کتے کی قسم، کیونکہ مصر کے کتے کے سر والا دیوتا اس کے نزدیک دیوتا نہ تھا بلکہ دیو تھا۔ جب وہ کسی دیوتا کی قسم کھاتا تھا تو پھر اس قسم کو پورا بھی کرتا تھا۔ یہ سہولتیں بہم پہنچانے کی کوشش کرتا کہ اور لوگ بھی اپنے وعدے پورے کریں۔

یوں بچپن ہی میں چھوٹی چھوٹی باتوں کے ذریعہ اور بعد میں بڑی بڑی باتوں کے ذریعہ یہ ظاہر ہو گیا کہ دیوتاؤں اور نیکی کے متعلق اس کے تصورات اور عام لوگوں کے تصورات میں اختلاف ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا لوگ اس اختلاف کو زیادہ شدت سے محسوس کرنے لگے اور اسی کی بنا پر وہ اس سے نفرت یا محبت کرنے لگے لیکن جن دنوں وہ بچہ تھا اور دوسرے بچوں کے ساتھ اپنے پیشہ کے گر سیکھ رہا تھا یہ اختلاف مخفی تھا۔ کسی شخص کو ایک معمولی سنگ تراش کے لڑکے سے کسی غیر معمولی بات کی توقع نہیں تھی۔

لمبا سفر

سورج کو پہاڑوں کے پیچھے غروب ہوئے آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا اور اس
گہرے درے میں کیمپ تاریک سے تاریک تر ہوتا جا رہا تھا۔ سپاہیوں نے
آگ کے گرد بیٹھ کر اپنا کھانا کھایا تھا۔ لکڑی جمع کرنے والے لکڑیوں کے آخری
گٹھے لے کر واپس آ چکے تھے۔ آگ کی روشنی سے پرے جنگل کے کنارے
پہلے پہرے والے سنتریوں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں جو شکوہ شکایت کر
رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جنرل ایندوسیڈیز نے آج کی رات اس قدر سخت
پہرہ خواہ مخواہ لگا دیا تھا۔ وہ لوگ ایتھنز سے صرف دو دن ہی کے فاصلے پر تو تھے
اور اس کے علاوہ میگرا کے علاقے میں تھے جہاں کے لوگ ایتھنز والوں کے
خواہاں تھے بلکہ حقیقت میں میگرا کے متعلق تو یہ خیال کرنا چاہیے کہ ایتھنز ہی ہے
جہاں فوج کا ایک دستہ متعین ہے۔ سقراط اپنے خیمہ کے ساتھیوں کرائٹو، ملے
سیس، نکلاوکن اور ارسٹن کے ساتھ آگ کے کنارے لیٹا لیٹا یہی سوچ رہا تھا۔
تربیت کے زمانہ کے بعد یہ اس کی پہلی مہم تھی اور ابھی تک اسے یہی محسوس ہو رہا
تھا جیسے دو فوجیوں کا کھیل کھیل رہا ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے، بھلا یہ بھی کوئی بات
ہوئی۔" اس نے کرائٹو سے کہا چونکہ یوبویا شمال میں گڑبڑ کر رہا ہے۔ اس لئے

ہمیں مغرب میں میگرا سے بھی پرے، اس ذلیل درے میں دن گزارنے پڑیں گے۔ کاش فارقلیس میرے قبیلے کو اپنے ساتھ یوبوئیا لے جاتا اور ہم لڑ بھڑ کے معاملہ ختم کرتے جنرل اینڈوسیڈیز تو یہاں اس طرح بیٹھ گیا ہے گویا ایک مہینہ تک یہیں رہنا ہو۔

کرانٹو پیر پھیلا کر آگ کے قریب اطمینان سے لیٹ گیا۔ ''شہر سے محبت کرنے والے سقراط کو دیکھو'' اس نے دوسروں سے کہا ''ایتھنز سے آئے ہوئے صرف پانچ دن ہوئے ہیں اور وہ واپس جانے کے لئے بے چین ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے پروا نہیں۔ میرا ارادہ تھا کہ اس ہفتے اپنے باغ جاتا۔ گرمیوں کے لئے انگور کی بیلوں کو ٹھیک ٹھاک کر آتا۔ لیکن اب ان کاموں کا منتظم میری غیر موجودگی میں بھی یہ کام اچھی طرح کرے گا اور پھر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان پہاڑیوں پر شکار خوب اچھا ہوگا۔ تم نے وہ ہرن دیکھا تھا جو کل لائی سکیز اپنے خیمہ کے لئے لایا تھا۔''

طے سیس نے کہا ''اس کے علاوہ اسپارٹا والوں سے واقف نہیں ہو۔ یہ بات ان کی وضع کے عین مطابق ہوگی کہ وہ فارقیس کی عدم موجودگی میں چپکے سے ان دروں سے گزر کر ایتھنز پر حملہ کردیں۔ مجلس کے ارکان اسی مسئلے پر غور کررہے تھے۔''

ہاں! اگر ہمارے آدمی مجلس میں غور کرتے ہیں'' سقراط نے کہا اور سب لوگ ہنس پڑے۔ آج کی رات تو پرانے لطیفے بھی، دل میں کھبے جا رہے تھے۔ کیا سماں تھا۔ آگ کے گرد دوستوں کا حلقہ، پھر دور کالے کالے پہاڑوں کا

سلسلہ، پیچ و تاب کھاتا ہوا دھواں، کھانے کی خوشبو، بہار کا نو طلوع چاند۔ کرداو نے سوچتے ہوئے کہا" چھ سال ہوئے جب ہم لوگ تربیت کے لئے بوسے گئے تھے اس وقت ہم لوگ اٹھارہ سال کے تھے ستراط تمہیں یاد ہے؟" ستراط نے گردن ہلائی" مجھے یاد ہے میں اپنے ہتھیاروں کی بے حرمتی نہیں کروں گا اور میدان جنگ میں اپنے قریب کھڑے ہوئے آدمی کو چھوڑ کر نہیں بھاگوں گا میں دیوتاؤں اور انسانوں کی چیزوں کے لئے جنگ کروں گا۔ خواہ میں اکیلا ہوں یا بہت سے آدمیوں کے ساتھ۔ میں اپنے وطن کو اس سے کم رتبہ نہیں بلکہ اس سے عالی مرتبت چھوڑ کر مروں گا۔ جتنا کہ وہ میری ولادت کے وقت تھا۔" (یعنی پہلے سے بہتر حالت میں) یہ سپاہیوں کے حلف کے الفاظ تھے جو ستراط نے دہرائے۔

وہ چپ ہوا تو۔۔۔۔۔۔دوسرے بھی حلف کے الفاظ دہرانے لگے۔ "میں منصفوں کے دانش مندانہ فیصلوں پر غور کروں گا اور موجودہ قوانین کے ساتھ ساتھ ان قوانین کا بھی پابند رہوں گا جو لوگ مل کر بنائیں گے۔ میں ایسے شخص سے ہرگز نہیں دبوں گا جو ان قوانین کو توڑے یا ان کی نافرمانی کرے۔ بلکہ میں اسے ایسا کرنے سے روکوں گا۔ خواہ میں اکیلا ہوں یا دوسروں کے ساتھ۔ میں اپنے اجداد کے مندروں کی عزت کروں گا۔ دیوتا اس کے شاہد رہیں۔"

"ہاں! ان دنوں ہمارا خیال تھا کہ ہم عظیم کارنامے کرنے والے تھے۔" کرداو نے کہا۔ یہ ان دنوں سے پہلے کی بات ہے جب وہ ہمیں بندرگاہ

کے قریب بارکوں میں لے گئے اور ہم سے قواعد شروع کرائی۔ بھائی! مجھے تو وہ کیا بھلا سا نام تھا اس کا بھینگا استاد ایسا برا لگتا تھا کہ اس پر ایک ہاتھ جھاڑ کر، سال سے پہلے ہی اپنے ہتھیاروں کے بے حرمتی کر دیتا۔

"وہ زمانہ اتنا برا بھی نہ تھا" کرائٹو نے کہا۔ "تھیئٹر میں بہر حال ہمیں اگلی نشستیں مل جاتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت فوج میں ہمارا دوسرا سال تھا اور ان دنوں میں مفتوں سقراط کے ساتھ فائلی کے پہاڑی قلعے میں رہتا تھا اور مجھے اس کے نہ ختم ہونے والے سوالات سننا پڑتے تھے۔"

سب پھر ہنس دیئے۔ کرائٹو کو سقراط سے کتنا لگاؤ تھا۔ یہ بات ہر شخص کو معلوم تھی۔ یہ عجیب وغریب قسم کی دوستی تھی۔ کرائٹو دولت مند زمیندار کا بیٹا تھا۔ دوست بھی تھا اور اس کی سوجھ بوجھ بھی معمولی تھی۔ ہاں اپنے کام میں جتا رہتا اور خالی خولی باتوں کی طرف کم دھیان دیتا اور سنگ تراش سقراط کے متعلق تو کوئی شخص وثوق سے کچھ کہہ ہی نہیں سکتا تھا۔ ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا تھا کہ وہ سست نہیں تھا اور اس کی سوجھ بوجھ اچھی تھی۔

وہ سقراط کے ہنسنے سے جھینپا نہیں۔ اس نے کہا "میں تو کچھ سیکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ ان دنوں میرا خیال تھا کہ دانش حاصل کرنا بالکل آسان ہے۔ چند سال کی جستجو کے بعد میں اسے حاصل کرلوں گا۔ لیکن آج جب میں چونتیس برس کا ہو چکا ہوں۔ چھ سال سے فوج میں ہوں اور چار مرتبہ ووٹ دے چکا ہوں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب میں نے عنفوان شباب میں سپاہی کا حلف اٹھایا تھا اس وقت کے مقابلہ میں اب میرا علم کم ہے۔ مثلاً ان الفاظ پر غور کرو۔

میں اپنے وطن کو اس سے کم رتبہ نہیں بلکہ اس سے عالی مرتبت چھوڑ کر مروں گا۔ جتنا کہ میری ولادت کے وقت تھا (یعنی پہلے سے بہتر حالت میں) میرا خیال ہے کہ اس وقت میں ان الفاظ کے معنی بخوبی سمجھتا تھا۔"

کراٹو نے میلے سیس کے ٹھوکا دیا۔ ارسٹن جو دوسروں کے مقابلے میں سقراط کی طبیعت سے کم آشنا تھا۔ جیسے اچانک جال میں پھنس گیا ہو۔ اس نے پوچھا۔ "اس میں کیا مشکل ہے۔"

"اس میں یہ چھوٹا سا لفظ بہتر جو ہے" سقراط نے کہا۔ "میں جس قدر اس لفظ پر غور کرتا ہوں اتنا ہی اور الجھتا جاتا ہوں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ اس کے کیا معنی ہیں۔"

"یہ بات تو بالکل آسان ہے، ارسٹن نے جواب دیا۔ "اس کے معنی ہیں زیادہ وسعت ۔۔۔۔ زیادہ جہاز، زیادہ عمارتیں، زیادہ زر اور اسی طرح کی دوسری چیزیں۔"

("پکڑا گیا۔" کراٹو نے میلے سیس کے کان میں کہا)

"آؤ غور کریں کہ میں تمہاری بات کا ٹھیک مطلب پا گیا ہوں کہ نہیں۔" سقراط نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم نے کلیوتائی مس کو دیکھا ہوگا۔ مٹھائی والوں کی دوکان پر اس سے تقریباً ہر شخص کی ملاقات ہو جاتی ہے۔"

ارسٹن ایتھنز کے اس سب سے موٹے جوان کے تصور سے ہنس پڑا۔ اس نے کہا۔ "یہ تو محال ہے کہ کسی نے اسے نہ دیکھا ہو۔ اتنا موٹا ہے کہ دیکھتے چلے جاؤ ختم نہیں ہوگا۔ لیکن اس کا اس بات سے کیا تعلق؟"

''اور تم نے ایوگین کو بھی دیکھا ہوگا؟''

''اولمپک کھیلوں کے فاتح کو؟ یقیناً''

''بتاؤ ان دونوں میں کون زیادہ بڑا ہے؟''

''یقیناً کلیونائی مس بڑا ہے''

''اور بہتر کھلاڑی کون ہے؟''

ایوگین کا ذکر آتے ہی ارسٹن کو اپنی شکست کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ ''میری بات کے بالکل لغوی معنی مت لو'' اس نے کہا ''میرا مطلب ہے کہ شہر اس وقت بہتر ہے جب وہ زیادہ مضبوط ہو اور اس کے شہری زیادہ کام کر سکتے ہوں۔ مختصر یہ کہ جب شہر کے لوگ ہر کام حسب مرضی کر سکیں۔''

''اب میں سمجھ گیا'' سقراط نے معذرت کے انداز میں کہا۔ ''اچھا تو پھر اس پر بھی غور کر لیا جائے۔ یہ بتاؤ کہ تم اپنا رفیق کسے منتخب کرو گے۔ بہادر کو یا بزدل کو؟''

''بیشک ایک بہادر آدمی کو۔''

''تو گویا بہادر آدمی بزدل سے بہتر ہوا؟''

''یقیناً۔''

''اور آدمی کے بہادر اور بزدل ہونے کا پتا کیسے چلتا ہے؟''

''میدان جنگ میں'' ارسٹن نے جواب دیا۔ اب وہ بہت محتاط ہو گیا تھا۔ لیکن اسے یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ آخر اس سوال و جواب کا نتیجہ کیا نکلنے والا

ہے۔

"جنگ میں" سقراط نے بات جاری رکھی۔ "جب دشمن پیش قدمی کر رہا ہو تو سپاہی بہت سی باتیں کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ اپنے گھٹنے ٹیک کر رحم کی درخواست کر سکتا ہے یا اپنی ڈھال پھینک کر اپنی مرضی سے کسی طرف کو بھاگ سکتا ہے۔"

"ہاں۔ لیکن یہ حرکت تو صرف ایک بزدل ہی کر سکتا ہے۔" ارسٹن نے جواب دیا۔

"صحیح ہے۔ صرف ایک بزدل ہی یہ کام کر سکتا ہے" سقراط نے کہا۔ "لیکن سوال یہ ہے کہ ایک بہادر آدمی بہادری کے بل بوتے پر کیا کر سکتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ وہ صرف ایک ہی کام کر سکتا ہے یعنی یہ کہ افسر کے حکم کی اطاعت کرے اور آگے بڑھتا جائے۔"

"صحیح ہے۔" ارسٹن بولا۔ وہ پوری طرح جال میں پھنس گیا تھا اور اب نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔"

"اس کے معنی یہ ہوئے کہ جنگ میں بہادر آدمی کے مقابلہ میں بزدل اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے کر سکتا ہے۔"

"ہاں۔" ارسٹن نے جواب دیا۔

"پھر بھی بزدل کو ہم بدتر اور بہادر کو بہتر کہتے ہیں۔"

ارسٹن نے شکست کے اعتراف میں گردن ہلائی۔

"اس کے معنی یہ ہوئے کہ اپنی مرضی کے مطابق کام کر سکنا اچھا اور بہتر ہونے کا ثبوت نہیں ہے" سقراط نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"ارسٹن آؤ یہ گتھی سلجھانے کی دوبارہ کوشش کریں۔ جو کچھ ہوا ہے اس سے تو کام نہیں چلے گا۔"

کرائٹو، میلے سیس اور کلاؤکن قہقہے لگا کر ہنس رہے تھے۔ ارسٹن جو بہت زندہ دل تھا وہ بھی قہقہوں میں شامل ہو گیا۔

"کرائٹو نے کہا۔" "ارسٹن مجھے تم کو بتا دینا چاہیے تھا کہ تم سقراط سے بحث میں جیت نہیں سکو گے۔

سقراط نے مسکرا کر گردن ہلائی۔" "میں نے ارسٹن کو شکست نہیں دی۔ دلائل نے دی ہے اور کرائٹو یہ کوئی کھیل تو ہے نہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم جانتے ہو کہ یہ کوئی کھیل نہیں ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔" ہر سال عمر کی خاص منزل پر پہنچ کر نئے لڑکے حلف اٹھاتے ہیں۔ گرمی میں طویل مسافت طے کرتے وقت ہم لاکھ اپنے متبرک اسلحہ کا مذاق اڑاتے رہیں۔ لیکن ہم کو اپنے حلف کا خیال بھی رہتا ہے۔ ہم میں سے کون ہے جو ایتھنز کو بہتر بنانا نہیں چاہتا لیکن ہم اس کے لئے کیا کرتے ہیں۔ ہم شہر سے متعلق چیزوں کی تو پروا کرتے ہیں لیکن بذات خود شہر کی کوئی پروا نہیں کرتے۔ جہاز بنا کر، بندرگاہ بنا کر، اسلحہ کے کارخانے بنا کر ہم سمجھتے ہیں کہ ہم شہر کو بڑا مضبوط اور اس قابل بنا رہے ہیں کہ وہ جہالت میں مبتلا ہو کر، جو چاہے کر سکتا ہے۔ مصر کے کتے کی قسم ہم ایتھنز کے لوگ آخر کب بیدار ہوں گے۔ اور کام کی باتیں کرنا سیکھیں گے۔" سقراط کی تقریر بہت طویل ہو گئی تھی۔ چاروں اسے خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ کرائٹو بولنے والا تھا کہ اندھیرے میں لڑکھڑاتا ہوا کوئی ان کے قریب آ گیا۔ یہ لائی

سکینز تھا جو برابر کے خیمہ میں رہتا تھا۔

''میں جنرل اینڈوسیڈیز کے پاس سے چلا آ رہا ہوں: اور یہ خبر لایا ہوں۔'' اس نے کہا'' میگرا میں رؤسا کی جماعت نے ہماری فوج کے دستے کے خلاف بغاوت کر دی ہے اور اسے قتل کر ڈالا ہے۔ پورا ملک باغی ہو گیا ہے۔ کورنتھ اپی ڈاروس اور سیکان بغاوت میں شریک ہیں۔ ایک آدمی جان بچا کر ہمیں اطلاع دینے آ گیا۔ باغیوں نے ایتھنز کی سڑک پر قبضہ کر لیا ہے۔ معلوم نہیں کوئی فارقلیس کو اطلاع کرنے جا سکا کہ نہیں۔ پیچھے سے اسپارٹا والے ہم پر کسی وقت بھی حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ صبح ہوتے ہی کوچ کے لئے تیار رہو۔''

اس طرح سقراط کی پہلی فوجی مہم شروع ہوئی۔ وہ دوسروں کے ساتھ سویرے ہی اٹھ بیٹھا اور اندھیرے میں ٹٹولتا ٹھوکریں کھاتا پھرتا تھا۔ سورج نکلتے ہی احکام صادر کر دیئے گئے۔ وہ جنگل میں خاموشی سے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ خیال تھا کہ دشمن گھات میں بیٹھا ہو گا۔ اونچی پہاڑیوں سے نیچے اتر کر ایک جگہ راستہ دائیں اور بائیں دونوں طرف جاتا تھا۔ یہاں انہیں فیصلہ کرنا تھا کہ کس سمت جائیں۔ داہنی طرف کا راستہ میگرا ہو کر ایتھنز جاتا تھا۔ لیکن اس سڑک پر باغیوں کا قبضہ تھا۔ بائیں طرف شمال میں ایتھنز کے شمالی بیوشا کے پہاڑ تھے۔ اینڈوسیڈیز نے بائیں طرف مڑنے کا حکم دیا۔

بعد کے مورخین نے اسے ایک معمولی سا فوجی سفر قرار دیا ہے۔ جنرل اینڈوسیڈیز اور اس کے تین قبائلی دستے شمالی پہاڑوں کے کڈھب راستوں اور ویرانوں سے اپنے وطن واپس آئے اور بس لیکن سقراط اور اس کے دوستوں کے

لئے یہ معمولی بات نہیں تھی۔ سقراط بعد میں بہت سی مشہور لڑائیوں میں شریک ہوا۔ ایسی لڑائیاں جو بعد میں لوگوں کی گفتگو کا موضوع بنی رہیں لیکن اس نے کبھی ان کے متعلق اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ وہ تو صرف اتنا کہتا تھا کہ ایک سپاہی کو چاہیے کہ اپنی جگہ پر ڈٹا رہے۔ وہ ایک بہادر سپاہی تھا اور بعد میں تو اس کی بہادری کے تذکرے عام ہوتے تھے۔ اس پہلی مہم میں وہ کراٹنو اور دوسرے ساتھیوں کے لئے یقیناً ایک اچھا رفیق ثابت ہوا ہوگا۔

وہ لوگ شمال کو جانے والی سڑک پر ہو لئے جو سمندر کے قریب پاکی کے گاؤں پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد ساحل کے کنارے خچروں کے راستہ پر چل دیئے۔ خچروں کا راستہ بہت ناہموار اور خراب تھا۔ اس پر پاؤں پھسلتے تھے۔ یہاں وہ لوگ ایک کے بعد ایک قطار میں جس طرح بن پڑا چلتے رہے۔ فوجی طریقے پر مل کر چلنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ راستہ میں انہیں کبھی ان میدانوں اور کھیتوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ اور سڑک پر موسم بہار کی کیچڑ پھیلی ہوئی تھی جو دھوپ میں خشک ہو رہی تھی۔ کچھ دیہات بھی ملے اور آخرکار وہ سمندر کے قریب کے ایک خاکستری رنگ کے قلعہ میں داخل ہوئے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں وہ ساحل سے دور علاقوں کی طرف جانے کے لئے تیار ہوئے۔

اب وہ ان علاقوں کی طرف چلے۔ ایتھنز والوں کو ان کی حالت معلوم نہیں تھی۔ اس بات کی کوئی امید نہیں تھی کہ ایتھنز کا کوئی جہاز انہیں لے جانے کے لئے آ جائے گا۔ یہ لوگ سمندر کے کنارے پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے پہاڑوں کی طرف نہیں جانا چاہتے تھے۔

یہ پہاڑ تھے بھی واقعی پہاڑ۔ آسمان پس منظر کی طرح تھا اور پیش منظر
میں سیتھرن پہاڑ کے سلسلے پھیلے ہوئے نظر آتے تھے۔ یہاں بسنے والوں کے
متعلق بڑی خوفناک روایتیں مشہور تھیں۔ وہ ان پہاڑی سلسلوں کے متعلق بچپن
سے سنتے چلے آئے تھے کہ یہاں ڈاکونائیس، شراب کے دیوتا، کے نیم دیوانے
پجاری، جینڈ رقص کیا کرتے تھے۔ اور ایسی عورتیں بھی یہاں تھیں جو اپنی گوری
گوری انگلیوں سے جنگلی جانوروں کو چیر کے رکھ دیتی تھیں۔ ان پہاڑوں کی وضع
ہی ایسی تھی۔ خاکستری سی چٹانیں، مڑے تڑے، چھوٹے چھوٹے صنوبر کے
درخت کہ ان کہانیوں پر خواہ مخواہ یقین آ جاتا تھا۔ راستے اتنے خراب اور پیچیدہ
تھے کہ بغیر کسی رہبر کے ایتھنز کے لوگوں کے لئے راستہ بھولنا آسان تھا۔

بڑی خیرت ہوئی کہ پی تھسین ان کے ساتھ تھا۔ پی تھسین کو ان لوگوں
نے پاس سے ساتھ لے لیا تھا۔ وہ شاید پتھر کا کوئلہ دہکانے والا یا کوئی چرواہا
تھا۔ کیونکہ اسے دور دور تک پہاڑی راستے معلوم تھے۔ پی تھسین بھلا مانس تھا اور
رہبری پر آمادہ۔ یہ سفر اس کی زندگی کا ایک زبردست واقعہ تھا۔ بعد میں اس نے
اینڈوسیڈیز اور اس کی فوج کے تین دستوں کے اس سفر کے حالات لوگوں کو
بتانے پی تھسین نے قصہ کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہوگا۔ پی تھسین بڑ ہانکتا تھا
کہ اس نے اپنے نیزہ میں سات آدمی بیک وقت پرو کے رکھ دیئے۔ اس سے
معلوم ہوتا ہے کہ راستہ میں خوب جھڑپیں ہوئی تھیں۔ یعنی ان دنوں جب پی
تھسین فوج کے دستے کی راہنمائی کا فرض ادا کرتا تھا۔

لیکن اس پہاڑی سفر کی بعض باتیں جو سقراط کو یاد رہ گئیں ان کا

تھین نے ذکر تک نہیں کیا۔ مثلاً پہاڑیوں پر چڑھتے اترتے وقت پاؤں کا جھاڑیوں میں الجھ کر رہ جانا، اگلے سپاہی کے پاؤں کے نیچے آ کر پتھروں کا پیچھے کی طرف لڑھک جانا۔ دوپہر کے وقت پیاس لگنا، نیچے تنگ گھاٹی کا ستارے کی طرح چمکنا۔ گدھوں کا سر پر منڈلانا اور رات کے وقت صنوبر کے جنگل میں لومڑیوں کا چلانا۔

کچھ خبر نہیں تھی کہ ایتھنز میں کیا ہو رہا ہے۔ دن کے وقت وہ اپنے قدم تیز کر دیتے تھے۔ کیونکہ ہر قدم ان کو ایتھنز کے قریب تر لے جا رہا تھا۔ رات کو جب آگ کے گرد بیٹھتے تو سوچا کرتے کہ ان دروں سے اسپارٹا والوں کو آنے میں کتنی دیر لگ سکتی ہے۔ ان کو میگرا الوسیس اور ایتھنز پہنچنے میں کتنے دن لگیں گے شمال میں تقدیر نے ساتھ دیا ہو تو قاصد فارقلیس کو کب ملا ہوگا۔ اسے واپس آنے میں کتنی دیر لگے گی۔ فارقلیس کے متعلق لوگوں کے مختلف اندازے تھے۔ لیکن اس بات کا کم لوگوں کو یقین تھا کہ وہ خود بھی وقت پر واپس وطن پہنچ سکتے ہیں۔

آخر کار وہ لوگ مائلی کے خاکستری سے قلعہ تک پہنچ گئے اور اب گھر بالکل سامنے تھا۔ پہاڑ کا موڑ کاٹتے ہی کسی نے نعرہ لگایا۔ ایتھنز اور پیچھے آنے والے سپاہی بھی شور مچانے میں شریک ہو گئے۔ اتنے دنوں وہ تصور میں جس شہر کو دیکھتے رہے تھے۔ آخر وہیں جا پہنچے تھے۔ سامنے چھت والی گڑھی تھی۔ نیچے بازار تھا۔ ساتھ ہی مجلس کی عمارت تھی۔ اور پھر گنجان بھرا پرا شہر۔ دور رہا سمندر اور سلامیز، جہاں ایرانیوں سے جنگ ہوئی تھی۔

کسی نے شور مچا کر اشارہ کیا۔ ذرا دیکھنا مغربی میدان میں نیزے چمک رہے ہیں گویا کوئی فوج جا رہی ہو۔ فائل سے ایتھنز چودہ میل تھا۔ آخری دس میل کھلی سڑک کا راستہ تھا۔ یہ فاصلہ انہوں نے جلد ہی طے کر لیا۔ اندھیرا ہونے سے قبل وہ اپنے سات دوسرے دستوں سے جا ملے تھے۔ دشمن ایتھنز کے بالکل سامنے پڑاؤ ڈالے پڑا تھا۔ اس رات کو سقراط نے شہر کی فصیل پہ پہرہ دیتے ہوئے دشمن کے پڑاؤ کی آگ دیکھی۔ آنے والا کل خدشات سے لبریز تھا۔ ہر شخص جانتا تھا کہ دشمن کی تعداد ایتھنز والوں سے کہیں زیادہ تھی۔

لیکن دوسرے دن جنگ نہیں ہوئی اور نہ اس کے دوسرے دن۔ اسپارٹا والے دو ایک دن ٹھہرے اور اس کے بعد اپنی چھولداریاں باندھ کر چلتے بنے۔ سیدھی سی بات تھی لیکن (گڑھی) ایکروپولس کی بلندیوں پر سے ایتھنز والوں کی جو بھیڑ کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی اسے اپنی آنکھوں پر یہ یقین نہیں آتا تھا آخر بات کیا ہوئی؟ شہر کے لوگ باتونی تو تھے ہی لیکن اس دن تو باتیں ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ فارقلیس کو اس بات پر کوئی حیرت نہ ہوئی لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ خبر آئی کہ اسپارٹا کا بادشاہ جس نے شہر پر چڑھائی کی تھی اس پر رعایا نے مقدمہ چلایا اور اسے بھاری جرمانہ کیا۔ وہ اور اس کا کمانڈر جلاوطنی کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ سال کے آخر میں جب فارقلیس نے اپنے حسابات لوگوں کی عام منظوری کے لئے پیش کئے تو اس نے ایک مد یوں دکھائی۔ ضروری اخراجات ۳۰ ہزار روپیہ (دس ٹیلنٹ) بہ سونا

انکشا غورث۔ دہریہ

اسپارٹا کے خطرے کے دور ہوتے ہی شہر میں ایک بار پھر پرامن زندگی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ ورزش گاہ کھلاڑیوں سے بھر گئی اور بوڑھے دالانوں میں بیٹھے جیوری کی رکنیت کے فرائض ادا کرنے کے انتظار میں بحثیں ہانکا کرتے۔ نانبائیوں کی دوکانوں سے پھر تازہ روٹیوں کی سوندھی خوشبو نکلنے لگی۔ لوہاروں کے کارخانے کی بھٹیاں سلگنے لگیں اور ہتھوڑے چلنے لگے اور پھر سقراط کی گلی سے پتھر تراشنے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ لیکن اگر آپ سوفرونس کس کے مکان پر جاتے تو بہت ممکن تھا کہ سقراط اور اس کے باپ سے آپ کی ملاقات نہ ہوتی۔ ہمارا خیال یہی ہے کہ اپنے دوسرے دوستوں کی طرح ان دونوں نے بھی کسی قومی کام کا ٹھیکہ لے لیا تھا۔ ایتھنیا کا نیا مندر ایکرو پولس کے جنوب میں تعمیر ہو رہا تھا اور وہ اس نئے مندر میں ایک ستون بنا رہے تھے۔

سقراط نے سنگ تراشی کے کئی کام کیے تھے لیکن اس نئے مندر میں ستون بنانے کا کام پچھلے تمام کاموں سے زیادہ سخت اور مشکل تھا۔ سنگ مرمر کی بھاری سلیں جن کی پہلی شکل کانوں ہی میں نکالی جاتی تھی پین ٹیلی کس پہاڑ سے

نکال کر کھڑ کھڑاتی ہوئی بیل گاڑیوں پر لاد کر لائی جاتی تھیں۔ ان پتھروں کو مزدور سخت محنت اور دشواری سے اتار پاتے تھے۔ اس کے بعد سوفرونس کس، سقراط اور ان کے ماہر غلام ان پر کام شروع کرتے تھے۔ یہ بھی عجیب منظر ہوتا تھا۔ یہاں آزاد اور غلام ایک ساتھ کام کرتے تھے۔ ہر پتھر کو ستون کے مطابق طبل نما صورت میں کاٹتے اور کاٹتے وقت اس کا خیال رکھتے کہ وہ اس ناپ سے بڑا رہے جتنا اسے مکمل تیاری کے بعد ہونا چاہیے۔ اس میں چار ایسے دستے لگے رہنے دیتے جن میں رسی اٹکا کر اس طبل نما ستون کو اوپر اٹھایا جا سکے۔ جب ایک طبل نما ستون تیار ہو جاتا تو وہ چرخیوں کی مدد سے اسے اٹھا کر ستون کے پہلے ٹکڑے پر رکھ دیتے اور اس طرح جما کر رکھتے کہ نچلے طبل نما ستون میں لکڑی کا کھونٹا ہوتو وہ اوپر کے ستون کے حلقہ میں ٹھیک بیٹھتا۔ ایسے ہی کوئی ایک درجن کے قریب طبل نما ٹکڑوں سے ستون کا عمود تیار ہوتا تھا۔ ہر ڈھول کے بالائی اور زیریں حصے کو اتنی احتیاط سے بنانا پڑتا تھا کہ تکمیل عمل کے بعد ستون ایک ہی پتھر کا ٹکڑا معلوم ہو۔ ہر جوڑ پر صرف ایک باریک سی لکیر نظر آئے۔

کام یہیں ختم نہیں ہو جاتا تھا۔ ستون کو اوپر سے نیچے تک بالکل سیدھا بھی نہیں ہونا چاہیے بلکہ وہ خفیف سا اندر کی طرف جھکا ہوا ہو۔ اور اس کا ترچھا عمودی قطعہ خمیدہ بھی ہو اور مخروطی بھی۔ لیکن اس کمال کے ساتھ کہ جس طرح پورے مندر کے فرش کا چڑھتا ہوا خم مشکل سے نظر آتا تھا۔ اسی طرح یہ بھی خم معلوم نہ ہو۔ عمارت کی تعمیر کے بعد صرف ماہر معماروں اور کاریگروں کو اس فرق کا علم ہو سکے اور عوام الناس مطمئن رہیں کہ چھت اور فرش بیٹھ نہیں جائیں گے۔

اگر یہ ستون بالکل سیدھے ہوتے تو یوں معلوم ہوتا کہ کوئی نہ کوئی چیز ضرور جھک جائے گی لیکن خم کے بوجھ سے یہ احساس ہوتا تھا کہ ستون خوب مضبوط ہیں اور چھت کا بوجھ برداشت کرنے کے قابل ہیں۔ جب ستون کھڑے ہو گئے تو سقراط مچان پر چڑھ گیا تاکہ پتھر کے بالائی حصے کو چھیل کر نیچے کے طبل نما حصے سے ہم آہنگ کر دے۔ اس کے علاوہ میں نفیس پھول بھی عمود میں بناتا تھے۔ جدول کے کناروں کو چاقو کی دھار سے بھی تیز ہوتا تھا۔

شہر سے دور لکڑی کے اس مچان پر سقراط کے کئی گھنٹے گزر جاتے تھے یہاں وہ دھوپ میں نیچے ان خالی میدانوں کا نظارہ کر سکتا تھا۔ جہاں کھیل ہوا کرتے تھے۔ اس کے داہنی طرف طویل دیوار ساحل کی طرف چلی جا رہی تھی۔ جہاں سبز اور نیلے پانی میں چمکتے ہوئے بادبان لہراتے رہتے تھے۔ سقراط اپنی مچان پر سے لائی کے ٹس اور چین ٹیلی کس کی پہاڑیوں اور سنگ مرمر کی کانوں کو بھی دیکھ سکتا تھا۔ یہاں سے ہائی میٹس کا پہاڑ بھی جو شہد کی مکھیوں کا مخزن تھا صاف نظر آتا تھا رات کے وقت ہائی میٹس سے ارغوانی روشنی پھوٹتی تھی اس کی بنا پر ایتھنز کو بنفشی تاج والا درخشاں ایتھنز کا خطاب ملا تھا اور یہ وہ نام تھا جسے ایتھنز کے باشندے بہت پسند کرتے تھے۔ یہ بات ایک شاعر نے ایتھنز کے متعلق کہی تھی۔ سقراط کا خیال تھا کہ اس بات میں حقیقت اور شاعری دونوں کو دخل ہے۔ غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے ڈھلتے ہوئے سورج کی سنہری شعاعوں میں شہر کی پہاڑیوں کے ارغوانی تاج کا درخشاں مرکزی ہیرا معلوم ہوتا تھا۔

لیکن انسان کے بغیر ستراط کے لئے اچھے سے اچھا منظر دشت و صحرا کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لئے اسے اصلی خوشی اس وقت ہوئی جب اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ مندر کے فرش پر کام کرنا شروع کیا۔ ان دنوں ایکرو پولس میں بڑی چہل پہل تھی۔ کاریگروں کے گروہ ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ایک جگہ پر کانوں سے تازہ سنگ مرمر آ رہا تھا۔ دوسری جگہ ایک پرانی طبل نما مرمری شکل کو اس نا تکمیل یافتہ مندر میں سے کاٹ کر صاف کیا جا رہا تھا۔ جسے اہل فارس نے جلا دیا تھا۔ اس طبل نما سپید پتھر کو صاف کر کے نئے دالان کے نازک عمودی ستون میں لگانا تھا۔ کہیں پر مچان کھڑے کئے جا رہے تھے اور کہیں پر کوئی ناظر ستونوں کی بنیادوں کی درستی کا معائنہ کر رہا تھا۔ بعض اوقات ایتھنز کا سربراہ کماندار فارقلیس بذات خود کسی ماہر معمار یا سب سے بڑے سنگ تراش فیڈی اس کے ساتھ آتا۔

فارقلیس کو ایکرو پولس آنے کا بہت شوق تھا۔ اسے نئے مندر پر بڑا فخر تھا۔ اس کی تعمیر کے لئے اس نے ایوان میں بڑی جہد و جہد کی تھی۔ جس دن سے تعمیر شروع ہوئی وہ روزانہ کام دیکھنے آتا تھا اور یہ کام تو دراصل بیروزگاروں کی امداد کے لئے شروع کیا گیا تھا۔

اہل فارس سے صلح ہو جانے کے بعد بحری بیڑے کی واپسی پر ملک میں جس گرانی کا دور دورہ ہو گیا تھا اسے کوئی شخص بھلا نہیں سکا تھا۔ ستراط کی تنزلی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اسے وہ زمانہ پوری طرح یاد تھا۔ اس وقت لوگ زیادہ تھے اور کام بہت کم تھا۔ لیکن اس بار ان بڑی عمارتوں کی تعمیر کی وجہ سے ہر شخص کو

صرف ایتھینا کے مندر کی تعمیر مقصود نہیں تھی۔ تعمیری پروگرام آگ کے دیوتا ہے فس ٹس کے مندر کی تعمیر سے شروع ہوا یہ مندر بازار میں تھا۔ اس منصوبہ کا ایک جزو یہ بھی تھا کہ لمبی دیواروں کا ایک دوسرا سلسلہ تعمیر کیا جائے جو ایتھنز کو بندرگاہ پائی ری اس سے ملا دے اور پائی ری اس میں بھی ایک نیا شہر تعمیر کیا جائے۔

اس کے علاوہ ایکروپولس میں ایک سے ایک بڑھ کر شاندار عمارت بن رہی تھی۔ جو اپنی وضع میں انوکھی تھی۔ ایتھینا کا مندر جسے کچھ دنوں بعد کنواریوں کی ہیکل کہلاتا تھا۔ (پارتھے نن) ان عمارتوں میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے چاروں طرف وہ لمبے ستون کھڑے ہو گئے تھے جن کی پوشیدہ کجی اور انحراف کو صرف سقراط اور اس کے دوست ہی دیکھ سکتے تھے۔ دوسروں کو اگر کبھی اس کا احساس بھی ہوتا تھا تو وہ سمجھتے تھے کہ یہ ٹھیک ہی بنائے گئے ہیں۔ ابھی چھجے پر نقش ونگار باقی تھے۔

یہ نقش ونگار فیڈیاز کے کارخانے میں تیار ہو رہے تھے۔ تکمیل کے بعد ستونوں کی سپیدی کے مقابلہ میں ان کی رنگینی کی لہروں کو بہت خوش نما نظر آنا تھا۔ پہلی قطار کے ستونوں کے اندرونی حصوں پر بھی ابھی نقش ونگار کا کام باقی تھا۔ نقشے تیار ہو چکے تھے اور سقراط ان کو دیکھ چکا تھا اندر کی دیوار پر جو مرقعے کھینچنے منظور تھے وہ یہ تھے۔ شہر کی حسین زندگی جس طرح وہ ایتھینا کے جلوسوں میں جھلکتی تھی۔ ایتھینا کے جلوس، شہسوار، رتھیں، قدم ملا کر چلتے ہوئے سپاہی، ٹوکریاں لئے ہوئے لڑکیاں، راہب، شہر کے حکام۔ یہاں تک کہ دیوتا بھی

شہریوں سے ملتے جلتے دکھائے جانے مطلوب تھے۔ سامنے اور پیچھے کے کارنس پر سنگ مرمر کے بتوں کو جگہ دی گئی تھی۔ چھت میں سنگ مرمر کا استعمال مطلوب تھا اور اس کے نقش و نگار کی یہ وضع سوچی گئی تھی گویا شہد کی مکھیوں نے چھتے لگا رکھے ہیں اور مندر کے اندرونی خنک حصہ میں محافظ دیوی کا وہ مجسمہ نصب کرنا مطلوب تھا جسے فیڈیاز نے ہاتھی دانت اور سونے سے بنایا تھا۔

فارقلیس اور اس کے دوستوں کے تعمیری منصوبے کاریگروں کے ہاتھوں میں پہنچ گئے تھے۔ سنگ تراش اپنی اعلیٰ فن کاری پر نازاں تھے کہ کس بلندی پر نقش و نگار بناتے ہیں۔ آزاد باشندوں کے علاوہ غلام اور بدیسی کاریگر بھی پورے جوش و خروش سے اپنے جوہر کی نمائش میں مشغول تھے۔ نقاشی کا کام ہو رہا تھا، پتھر ادھر سے ادھر لائے جا رہے تھے اور نیچے سے اوپر پہنچائے جا رہے تھے۔ فارقلیس جب روزانہ آتا تو کام اور آدمیوں کے چہروں کو دیکھ کر خوش ہو جاتا۔

فارقلیس کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ایکروپولس آتے تھے۔ اس مندر پر ہر شخص کو ناز تھا۔ شاید ہی کوئی شہری ہو جو یہ دیکھنے نہ آیا ہو کہ تعمیر اب کس مرحلہ پر ہے۔ یہاں تک کہ عورتیں بھی آتی تھیں۔ اعلیٰ خاندانوں کی وہ عورتیں جو عام مجمعوں میں مشکل سے دیکھی جاتی تھیں۔ یہ عورتیں پسینہ میں شرابور کاریگروں کے درمیان بڑی نزاکت سے آتیں۔ فیڈیاز اپنے کارخانے میں ان عورتوں کا بڑا احترام کرتا۔ ان عورتوں کے آنے جانے کی وجہ سے لوگ طرح طرح کی باتیں بنانے لگے۔ لیکن ایک عورت کی وجہ سے تو تمام بہتان تراشی

اٹھے۔ اس عورت کا نام الیسپاسیا تھا۔ یہ خوب صورت عورت ایشائے کوچک کے ایک مقام مائیلیٹس کی رہنے والی تھی۔ لوگوں میں عام طور سے مشہور تھا کہ سلجھے ہوئے، سنجیدہ دل و دماغ کا حامل جنرل فارقلیس اس عورت کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا۔ الیسپاسیا کے لئے ایتھنز میں کوئی مقام نہ تھا۔ وہ خود فارقلیس کے بنائے ہوئے بیرونی شادیوں کے قانون کے بموجب اس کی جائز بیوی تسلیم نہیں کی جا سکتی تھی اور اس کے لڑکے کو ایوان کی خاص اجازت کے بغیر حق شہریت نہیں مل سکتا تھا۔ سقراط کے کچھ دوستوں کو فارقلیس اور الیسپاسیا کے تعلقات پر اعتراض تھا لیکن جب سقراط الیسپاسیا سے ملا تو اس نے اسے پسند کیا۔ اسے خوشی ہوئی کہ فارقلیس نے ایک ایسی عورت سے محبت کی تھی جو سوچ سکتی تھی۔

فارقلیس کا ایک دوسرا دوست جو اکثر اس کے ساتھ رہتا تھا۔ سائنس داں انکثا غورث تھا۔ وہ بھی ایشیائے کوچک کا رہنے والا تھا۔ فارقلیس نے اسے ایتھنز بلایا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ بالکل ہی دوسری دنیا کا آدمی تھا۔ جس زمانے میں اس کا گھربار تباہ ہو رہا تھا وہ آسمان کے مطالعہ میں مشغول تھا۔ لوگوں نے اس کا نام "دماغ" رکھا تھا۔ اور اسے کافی پریشان کرتے تھے۔ سقراط کو انکثا غورث سے بات کرنے کا موقع میسر نہ تھا لیکن وہ اسے دیکھتے ہی اس کی طرف مائل ہو گیا۔ اس نے انکثا غورث کے خیالات کو جاننے کی کوشش بھی کی۔ لوگوں نے اسے بہت کچھ بتایا لیکن جو وہ بتاتے تھے اس کا بیشتر حصہ سقراط کو بالکل فضول معلوم ہوتا تھا لیکن جب اس نے چھان بین کی تو اسے انکثا غورث کی

چکر کاٹتا ہوا سورج اور ہمارے درمیان آتا ہے تو سورج دن کے وقت سیاہ پڑ جاتا ہے اور جب ہماری دنیا سورج کی روشنی کو چاند سے چھپا لیتی ہے تو چاند بھی سیاہ ہو جاتا ہے۔

ایتھنز کے لوگ اس سلسلہ میں بڑے زور و شور سے بحث میں الجھ گئے جس میں بعض اوقات بڑی گرمی پیدا ہو جاتی تھی اور جو دوستانہ بات چیت کی حدود سے گزر جاتی تھی۔ جن لوگوں کو دیوتاؤں سے نذر نیاز کے سوا کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ بھی متفکر ہو گئے کہ پتھروں اور گرم سفید دھات کی یہ باتیں مذہب پر اثر کریں گی۔ سقراط نے دیکھا کہ دیوتاؤں کے بعض پرجوش ہمدرد فارقلیس کے سیاسی دشمن بھی تھے۔ فارقلیس کے دشمن اپنے کو شرفاء کہتے تھے۔ فارقلیس اگرچہ بذات خود ایتھنز کے ایک اعلےٰ خاندان کا فرد تھا لیکن ابھرتی ہوئی جمہوریت کا حامی ہونے کی وجہ سے وہ ان لوگوں کو گنے چنے کہہ کر پکارتا تھا۔ شرفا ہوں یا کوئی اور، سقراط پر ایک بات واضح ہو گئی تھی کہ وہ لوگ انکثا غورث اور اس کے علمی نظریوں کو سیاسی جھگڑوں میں گھسیٹ رہے تھے۔ متعصب بوڑھا غیب داں ڈایوپی تھیس۔ جس کی گزر اوقات آسمانی اشارات اور معجزات کی تعبیر کرنے پر تھی۔ وہ بھی انکثا غورث کا مخالف تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ آسمانی باتوں میں محض مالی آمدنی کے خیال سے دلچسپی لیتا تھا لیکن اپنے کام میں ایماندار تھا۔ ڈایوپی تھیس کا ایک عزیز ڈایون جو سقراط کے ساتھ ستونوں پر کام کرتا تھا، کھلم کھلا کہتا تھا کہ جب تک انکثا غورث کو موت کی سزا نہیں دی جائے گی اس وقت تک اس شہر پر دیوتا مہربان نہیں ہوں گے۔

خود ایوان میں حملہ کی ابتدا کرے۔ اسے انکشا غورث کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ وہ صرف ان لوگوں کے خلاف ایک نیا قانون تجویز کرے گا جو مذہب پر عمل نہیں کرتے اور آسمانی چیزوں کے متعلق نظریات پیش کرتے ہیں یہ قانون یقینی طور پر پاس ہو جائے گا کیونکہ جو شخص بھی اس کی مخالفت کرے گا وہ بھی لامذہب قرار دیا جائے گا۔ قانون پاس ہو جانے کے بعد سیاست دان عدالتوں میں نپٹ لیں گے۔ اور پھر جو کچھ بھی ہوگا قانون کے مطابق ہوگا۔

ڈایون منصوبہ بیان کر چکا تو گرما گرم بحث شروع ہو گئی۔ سقراط کا ایک دوست فلی نس جو کسی دوسرے ملک کا رہنے والا تھا۔ دنیا میں خوب گھوما تھا اور ایک روشن خیال آدمی تھا، انکشا غورث کی پرزور حمائت کرنے لگا۔ اس نے ڈایون سے کہا" انکشا غورث نے جو کچھ کہا ہے ممکن ہے صحیح ہو۔ اگر اوپر پتھر نہیں ہیں تو گوٹ دریا کے پاس کالا پتھر کہاں سے آیا۔"

ڈایون غصہ سے آگ بگولہ ہو گیا" ان سب چیزوں کی تحقیق کرنا ہمارا کام نہیں ہے میں تم سے کہتا ہوں دیوتاؤں کو مت چھیڑو۔ ہم آدمیوں کا اس سے کیا کام کہ اوپر پتھر ہیں کہ نہیں۔ کیا تم دیوتاؤں کو ناراض کر کے شہر میں طاعون اور بربادی پھیلانا چاہتے ہو؟"

فلی نس نے سکون سے کہا" طاعون اس وقت آتا ہے جب ہوا یا پانی خراب ہو۔ کسی اچھے طبیب سے پوچھ لو اور جہاں تک بربادی کا تعلق ہے تو کیا عقل مند سولن نے نہیں کہا تھا کہ ایتھنز دیوتاؤں کی مرضی سے تباہ نہ ہوگا۔ بلکہ اپنے شہریوں کی بے وقوفی اور لالچ سے تباہ ہوگا۔"

یہ بات سن کر ڈایون لال پیلا ہو گیا۔ اس نے ملحدوں پر لعنتیں بھیجنی شروع کر دیں۔ جب اس کی بات ختم ہوئی تو فلی نس نے موقع دیکھ کر کہا۔ ڈایون تم اس طرح بات کرتے ہو جیسے دیوتاؤں سے تمہارا بڑا میل جول ہے۔ کیا تم نے کبھی کسی دیوتا کو دیکھا ہے؟ کیا تم نے کبھی اسے چھوا ہے؟ کیا تم گزشتہ یا موجودہ زمانے کا کوئی ایسا واقعہ بتا سکتے ہو جس کی طبعی توجیہ نہ کی جا سکتی ہو؟"

جتنے لوگ وہاں موجود تھے ان میں سے بیشتر ڈایون اور اس کی بزعم خود غلط پارسائی کے خلاف تھے لیکن اس وقت فلی نس کے حد سے بڑھ جانے پر ان لوگوں نے احتجاج کیا اور سب ایک ساتھ بولنے لگے۔ آخر کار سوفرونس کس نے سب کو خاموش کرنے کے لئے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ سوفرونس کس اب بوڑھا ہو گیا تھا اور اپنے گھر میں امن چاہتا تھا۔

"ہو سکتا ہے تم دونوں کسی حد تک صحیح ہو۔ ہو سکتا ہے (جیسا فلی نس کہتا ہے) انکسا غورث نے سورج کی حقیقت معلوم کر لی ہو۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنی جوانی میں بھی اس قسم کی باتیں سنی تھیں۔ ان دنوں مٹی اور پتھر کا سوال نہ تھا بلکہ یہ دعویٰ تھا کہ سورج آتشیں بھاپ ہے اور یہ بھی مذہب کے خلاف جاتا ہے لیکن ہم ان باتوں کو عدالتوں میں لے جانا پسند نہیں کرتے تھے۔"

ڈیوان نے احتجاج کیا

"ایک منٹ ٹھہرو" سوفرونس کس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "میں کہہ چکا ہوں کہ ہم ایسی باتوں کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ عدالتوں میں لے جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ اب حالات مختلف ہوں۔ مجھے فلی نس کی باتیں

کرنے کا طریقہ پسند نہیں اور جب آج کل کے بچوں کو جوان ہوتے دیکھتا ہوں تو مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ کل دین ہی کی مثال لے لو جو چڑا رکھنے کا کام سیکھ رہا ہے اس کی زبان تیز اور تلخ ہے اور وہ ہر اس شے سے نفرت کرتا ہے جو اس سے بزرگ ہے۔ میں تو یہ سوچتا ہوں میرے پرانے وقتوں سے دیوتاؤں کا جو ڈر اور خوف ہمارے دلوں میں بیٹھا چلا آتا ہے وہ کچھ زیادہ ہی ہو جائے تو اچھا ہے۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ ہاں زمانہ بدل گیا ہے" اور یوں معلوم ہوتا تھا گویا سوفرونس کس اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے۔ "مجھے یاد ہے کہ جب ہمیں سلامیز کے مقام پر بحری فتح ہوئی اور ایرانی بیڑوں میں بیٹھ کر بھاگ گئے تو ہمیں اس بات کا احساس ہوا کہ ہم آزاد ہیں اور ہمیں معلوم ہوا کہ دیوتا ہمارے ساتھ ہیں۔ ان کے خلاف ان دنوں کسی کی جرأت نہ تھی کہ وہ بات کرے۔ سورج، چاند اور ایسی دوسری چیزوں سے ہم کو کیا غرض تھی لیکن اب ہو سکتا ہے کہ ڈایون صحیح ہو۔ شاید پرانے عقائد کو زندہ رکھنے کے لئے یہی ضروری ہو۔ ایسے زمانے میں کوئی کیا کہہ سکتا ہے کہ شہر کے لئے کیا بہتر ہوگا۔"

سقراط اپنے باپ سے متفق نہیں تھا لیکن وہ احتراماً خاموش رہا اور جب تک سوفرونس کس سونے نہیں چلا گیا وہ مباحثے میں شریک نہیں ہوا۔ مباحثہ رات گئے تک جاری رہا لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ ڈایون اور فلی نس دونوں اپنی بات پر سختی سے اڑے رہے۔ سقراط نے اس مباحثے سے یہ نتیجہ نکالا کہ ڈایون اور اس کا باپ دونوں غلطی پر تھے۔

وہ جانتا تھا کہ صداقت سب سے اہم چیز ہے۔ دیوتاؤں کو صداقت

سے کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ وہ تو صداقت کے چاہنے والے تھے۔ لیکن اگر تم صداقت کو چھپانے کی کوشش کرو تو ایک اور خطرے سے دو چار ہو گے۔ ممکن ہے تم ایسی چیز کو نقصان پہنچا دو جو سب سے زیادہ قیمتی ہے یعنی تمہاری اپنی ذات جو دیوتاؤں سے بہت قریب ہے۔ ڈایون بے وقوف تھا۔ سوفر ونس کس دانا بوڑھا تھا لیکن وہ یہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ صداقت کی راہ میں حائل ہو کر وہ ایتھنز کی مدد نہیں کرے گا بلکہ الٹا اس کو نقصان پہنچائے گا لیکن صداقت کیا ہے؟ کیا فلی نس سچ کہتا تھا کہ ہر واقعہ کی طبعی توجیہ ہو سکتی ہے۔ یہ بات تو سچ معلوم ہوتی تھی۔ پھر بھی اس میں کوئی ایسی بات تھی جو سقراط کو مطمئن نہیں ہونے دیتی تھی۔ وہ اسی سوچ بچار میں سو گیا۔

دوسرے دن، جیسا کہ ہر شخص کو امید تھی ڈایوپی تھیس نے اپنا قانون پاس کروا لیا اور اس کے نتیجے کے طور پر انکشا غورث کو عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ اس پر الحاد کا الزام لگایا گیا۔ اس جرم کی سزا موت بھی ہو سکتی تھی۔ اس مقدمہ کی وجہ سے ان دنوں ایتھنز میں ہر طرف لوگ بحث مباحثہ میں مصروف رہے لیکن خوش قسمتی کی بات ہے کہ شہر کا ضمیر بیدار رہا اور سائنسدان کو موت کی سزا نہیں دی گئی۔ فارقلیس نے اسے نجات دلا دی اور شہر بدر کر دیا۔ ایشیائے کوچک واپس پہنچ کر لمپساکس کے شہر میں انکشا غورث کو ایک اور سرپرست مل گیا۔ یہاں وہ آخر وقت تک مطالعہ میں مصروف رہا۔

فارقلیس اور اس کے دوست ہمیشہ انکشا غورث کی کمی محسوس کرتے تھے۔ جب اس کی تصنیف علوم طبعی پر شائع ہوئی تو بہت مقبول ہوئی۔ چاند اور

سورج کے متعلق اس کے خیالات میں کوئی نیا پن یا ندرت نہیں تھی۔ کیونکہ بعد کے ہیئت شناسوں نے جو اس سے زیادہ قابل تھے اس کے کام کو آگے بڑھایا لیکن اس کی غلطیوں کی طرف بھی توجہ دلائی۔ شاید لمپساکس کے بچوں نے انکسا غورث کو محترم گردانا کیونکہ اس نے درخواست کی تھی کہ اس کی وفات کے دن سکولوں میں چھٹی ہوا کرے۔

انکشاف

سقراط اگرچہ انکسا غورث سے کبھی صحیح معنوں میں آشنا نہیں ہوا تھا لیکن وہ اسے کبھی بھول نہ سکا۔ اس آدمی میں ضرور کوئی بہت ہی شاندار بات تھی جو یہ کہتا تھا کہ وہ شہرت یا عیش و آرام کے لئے نہیں بلکہ چاند، سورج اور زمین کا مطالعہ کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ علم کی یقیناً بڑی اہمیت تھی۔ جیسا کہ بوڑھے کمہار نے ایک مرتبہ کہا تھا۔ علم حاصل کرنے کے لئے مطالعہ کرنا چاہیے۔ محض حیرت سے کام نہیں چلتا۔" لہذا سقراط نے دنیا کے نظام کے متعلق علماء کے اقوال کا مطالعہ شروع کر دیا۔ جہاں تک اس کا اپنا تعلق ہے وہ عوام کی نسبت زمین، سورج اور آسمان کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا، لیکن اگر چیزیں منظم تھیں تو ہر چیز کا یکساں نظام ہونا چاہیے تھا۔ اگر انسان کو ان قوانین کا جن کی رو سے یہ زمین بنی ہے علم ہو جائے تو پتھر مردوں اور عورتوں کے اعمال کی توجیہ بھی کی جا سکتی ہے۔

سقراط مطالعہ کرتا رہا۔ ورزش گاہ کے لباس تبدیل کرنے والے کمروں میں جو علماء جمع ہوتے تھے یا دالانوں میں ٹہلتے تھے وہ ان کی باتیں غور سے سنتا انہیں میں آرکی لاؤس نامی ایک شخص تھا جو انکسا غورث کا شاگرد تھا۔ بعد میں یہ

سقراط کا استاد کہلایا۔ بعض بدیسی مثلاً سیمیاس اور سیبیر جو ریاضی دان فیثا غورث کے نظریات کے محرم اسرار تھے اس کے جگری دوست ہو گئے۔

چونکہ سقراط کا ذہن بہت ہی تیز اور سراغ رو تھا اور اس کی یادداشت اچھی تھی۔ سقراط بہت ہی جلد اپنی فہم و دانش کی بنا پر مشہور ہو گیا۔ اب اگر کوئی طالب علم شہر میں آتا تو اس کی ملاقات سقراط سے ضرور ہوتی اور چونکہ ایسی باتوں میں دلچسپی لینا فیشن میں شامل ہو گیا تھا لہذا وہ ایسے گھروں میں مدعو کیا جاتا جہاں مزدور قسم کے کاریگروں کو بار حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ ان باتوں سے سقراط میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اسے نئے نئے ملنے والوں سے دلچسپی تھی۔ اس کے نزدیک ہر شخص دلچسپ تھا لیکن وہ لوگوں کو دولت کے بدلے افکار کے پیمانے سے ناپتا تھا۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہ لوگوں کو سرے سے پرکھتا ہی نہ تھا کہ جو علم و ذکاوت اسے نظر آتی تھی وہ اس دانش سے خالی تھی جس کی جستجو میں وہ مصروف تھا۔ اسے ایسے دانشور کی تلاش تھی جو اسے یہ بتا سکتا کہ چیزیں فی الواقع جیسی ہیں ایسی کیوں ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک ماہر کوزہ گر کو جو اصولی علم کوزے یا صراحی کی وضع قطع کے متعلق حاصل ہوتا ہے اس سے ہر کوزے یا صراحی کی ساخت یا نوعیت کی توضیح و توجیہ کی جا سکتی ہے۔

سقراط یہ جان کر حیران ہوا کہ انسان نے ہمیشہ چیزوں کے نظم و ربط کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ سو سال سے زیادہ ہوا لوگ یہ سوال برابر پوچھ رہے تھے کہ دنیا کس چیز سے بنی ہے وہ جیسی کہ موجود ہے کس طرح وجود میں آ گئی۔ سوالات ایتھنز کے قدامت پسند ہی نہیں بلکہ مشرق اور جنوب کے یونانی بھی

کرتے تھے۔ انکشا غورث کی باتیں دوسرے لوگوں کے لئے اتنی تعجب خیز نہیں تھیں جتنی ایتھنز کے لوگوں کے لئے کیونکہ علمی (سائنسی) تصورات سے وہ پہلی بار دوچار ہو رہے تھے۔

دنیا اور اس کی تخلیق کے متعلق بعض نظریات ایسے پیش کئے جاتے تھے جن سے معلوم ہوا کہ سائنس دان بھی دوسروں کی طرح جلد بازی سے کام لیتے تھے۔ مثال کے طور پر مچھلیوں کے متعلق صقلیہ کے معاصر سائنس دان ایمپی ڈوکلیز کا نظریہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ ایمپی ڈوکلیز کا خیال تھا کہ پانی کی مخلوق بیشتر پانی سے بنی ہے۔ مٹی کی مٹی سے اور پرند، جو اوپر کی طرف اڑتے ہیں آگ سے بنے ہیں لیکن مچھلیاں اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں۔ ان میں آگ بھری ہے اور وہ پانی میں اس لئے اترتی ہے کہ ٹھنڈک حاصل ہو۔ جب سقراط نے یہ بات سنی تو وہ سمجھ گیا کہ ایمپی ڈوکلیز ایسی بات کی توجیہ کی کوشش کر رہا ہے جو اس نے کبھی دیکھی ہے۔ اس نے کسی صبح بندرگاہ پہنچ کر ملاح کی کشتیوں میں مچھلیاں دیکھی ہوں گی جو پانی کے لئے تڑپ رہی ہوں گی۔ لیکن اس نے کسی مچھلی کو پکڑ کر کیوں نہ دیکھا۔ کہ گرم ہے یا نہیں۔ فیصلہ تو تبھی ہو سکتا تھا۔ حالانکہ اسی سائنسدان نے ہمیں اس بات سے آگاہ کیا تھا کہ انسان کے جسم میں خون کس طرح رواں ہوتا ہے اور سانس کس طرح اندر آتی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ مشاہدے کے معاملے میں وہ محتاط تھا۔

تو اب سقراط کو معلوم ہو گیا کہ مدت سے یہی ہو رہا ہے۔ مشاہدات معقول اور نامعقول قیاس آرائیاں گڈمڈ ہو کے رہ گئی تھیں۔ بعض اوقات ارفع

کی رفتار بہت سست معلوم ہوتی تھی اور ایک سائنس دان جس طرح دوسرے سائنس دان کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اس سے ہمت شکنی ہوتی ہے لیکن سائنس دانوں کی تمام کاوشوں کی تہ میں ایک بات تھی جسے فکر جلیل کا لقب دیا جا سکتا ہے اور جس کی وجہ سے ان کی حماقت بھی ایک طرح کی دانائی معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایک قانون کے جویا تھے۔ ایک ایسا قانون جو بدلتا نہ ہو اور جو پوری طرح ہم آہنگ ہو اور جس کی مدد سے چیزوں کی کلیت واضح کی جا سکے۔

ایک شخص کا خیال تھا کہ ہر چیز پانی سے بنی ہے۔ اس نے مصر میں نیل کی طغیانی کے بعد نئے پیدا شدہ کیڑوں کو کیچڑ میں رینگتے دیکھا تھا۔ دوسرے کا خیال تھا کہ دنیا دھواں ہے جو پھیل گیا ہے یا دب گیا ہے۔ شاید اس نے دھوئیں کو پانی بنتے اور پانی کو جم کر برف بنتے دیکھا تھا۔ ایک اور شخص کہتا تھا کہ دنیا آگ سے بنی ہے کہ جلتی ہے اور بجھ جاتی ہے۔ اس وقت طبیبوں میں ایمپی ڈوکلیز کا یہ خیال بہت مقبول تھا کہ عناصر چار ہیں۔ مٹی۔ ہوا۔ آگ اور پانی۔ (محبت اور کشش) کی بنا پر یہ ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے تھے اور اختلاف و فساد کی بنا پر پھر الگ ہو جاتے تھے۔ عناصر کے اس کھیل سے دنیا اور انسان وجود میں آ گئے۔

عالم کے بنیادی مواد کے متعلق تمام نظریات میں ایک اشکال تھا جس کو حل کرنا بہت مشکل تھا۔ وہ یہ تھا کہ یہ مواد خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو آخر ان چیزوں میں کس طرح تبدیل ہو جاتا ہے جو ہمیں موجود ملتی ہیں۔ مغربی یونان کے سائنس دانوں کے ایک گروہ کا تو یہ دعویٰ تھا کہ کسی شے کا حرکت کرنا یا متغیر

ہونا محال ہے۔

اس سلسلہ میں یک طرفہ دلائل پیش کیے جاتے تھے۔ مثلاً کہتے تھے کہ ایک کچھوے کا تصور کرو۔ جو سب سے زیادہ دھیما چلنے والا جاندار ہے اور تیز قدم ایکی لیز اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایکی لیز اسے جا لے۔ فرض کرو کہ ایکی لیز کچھوے کا تعاقب کرتا ہوا وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں سے کچھوا چلا تھا لیکن اس وقت تک کچھوا ابھی تھوڑا بہت آگے بڑھ گیا ہوگا۔ ایکی لیز ابھی تک اس تک نہیں پہنچا اور اب اس جگہ پہنچنے کے لئے جہاں کچھوا جا پہنچا ہے۔ چاہے ایکی لیز کو ایک سیکنڈ کا دسواں حصہ ہی صرف کرنا پڑے لیکن پھر بھی کچھوا اس وقفہ میں تھوڑا سا آگے ضرور بڑھ جائے گا۔ غرضیکہ یہ ذہنی عمل ہمیشہ جاری رہے گا اور ایکی لیز کچھوے کو کبھی نہیں پکڑ سکے گا۔ یہ یوں تو بڑا ہی احمقانہ خیال ہے۔ لیکن جب لوگوں نے اسے احمقانہ کہا تو زینو نے جس سے یہ معما منسوب ہے جواب دیا کہ اگر لوگ تغیر اور حرکت جیسی ناممکن چیزوں پر یقین لے آئیں گے تو ان کے دماغ میں ایسی ہی الجھنیں پیدا ہوا کریں گی۔

تو مسئلہ کی یہ صورت تھی۔ سقراط جتنا سوچتا تھا اتنا ہی الجھتا جاتا تھا۔ وہ چیزیں جو اسے آج تک آسان معلوم ہوتی تھیں، مثلاً بڑا ہونا یا ایک میں ایک جمع کرنا، اب اسے مشکل باتیں نظر آنے لگیں۔ سائنس دانوں کی دلیلیں بے ثمر نظر آتی تھیں۔ اس کی شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ دنیا کے حقیقی واقعات کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے بلکہ اپنے نظریات کی بنیاد پر دوسرے نظریات پر رکھتے جا رہے تھے۔ سقراط نے دیکھا کہ صرف اطباء ہی احتیاط سے

مشاہدہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اگرچہ کبھی کبھی وہ بھی الجھ کر رہ جاتے تھے کیونکہ ان کی کوشش بھی یہی ہوتی تھی کہ سائنس دانوں کا عناصر اربعہ والا نظریہ، ذونوں کی طرح ہر چیز پر لاگو ہو جائے اور ہر مسئلے کی توجیہ اسی کے ذریعے ہو۔

سائنس دان بھی ان دنوں اسی چیز سے دلچسپی لے رہے تھے جس سے اطباء کو دلچسپی تھی، یعنی جسم انسانی۔ فارقلیس اور اس کے دوست انسان کو ایسی عجیب و غریب مخلوق سمجھتے تھے جو ہر بات پر قادر ہے۔ سائنس دان انسان کا جسم دیکھ کر حیرت ہو جاتے تھے۔ وہ کہتے تھے انسان بھی کیا عجیب و غریب چیز ہے۔ اس کی آنکھیں ہیں جو کسی طرف مڑ سکتی ہیں۔ نیند کے لئے بند ہو سکتی ہیں۔ پلکیں ہیں جو ہوا کو چھان دیتی ہیں۔ پھر ابرو ہیں جو پسینے کو دور رکھتے ہیں۔ اس کے اگلے دانت غذا کو کاٹنے کے لئے اور پچھلے دانت اسے چبانے کے لئے ہیں۔ اس کا منہ اس کی آنکھوں اور ناک سے نزدیک ہے تاکہ وہ سہولت سے طے کر سکے کہ کیا کھاؤں۔

جب ایمپی ڈاکلیز نے ان سب باتوں پر غور کرنا شروع کیا تو اسے معلوم ہوا کہ انسان جیسی عجیب و غریب مخلوق کا ارتقا تبھی ہوا ہوگا کہ ترقی کی کوشش برابر جاری رہی ہوگی۔ کامیابی ہوگئی تو خیر ورنہ جب غلطی ہوئی تو اس سے بھی سبق سیکھا گیا ہوگا۔ پرانے زمانے کے حیرت انگیز جاندار، جن کا آج نام نشان تک کوئی نہیں جانتا ارتقا کے مرحلوں سے گزرے ہوں گے۔ مثلاً ایسے جاندار جن کا سر ایک طرف اور سینہ دوسری سمت ہوتا ہوگا۔ ایسے بیل جن کا چہرہ آدمیوں کا سا اور آدمی جن کا چہرہ بیلوں کا سا ہوتا ہوگا۔ یہ جاندار مٹ گئے اور

بھلا دیئے گئے۔ کیونکہ وہ اس قابل نہیں تھے کہ زندہ رہتے۔ شروع میں تمام جانداروں کی پیٹھ میں ہڈی کا ایک ٹکڑا تھا۔ اتفاق سے کسی جاندار کی ہڈی مڑ گئی اور ٹوٹ گئی۔ یہ ارتقائی مرحلہ تھا۔ اس ٹوٹ پھوٹ کے جاری رہنے سے بہت فائدہ ہوا۔ اسی کی بنا پر ایمپی ڈوکلیز نے کہا کہ انسان کی ریڑھ کی ہڈی جو ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے ٹکڑوں سے مل کر بنی ہے تو یہ ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے۔

سقراط کو یہ سائنس بہت ہی دلکش معلوم ہوئی خصوصاً جب سائنس دانوں نے انسان کے ذہن کے متعلق گفتگو شروع کی تو سقراط کی دلچسپی بڑھ گئی۔ انسان کس طرح سوچتے ہیں؟ سائنس دان اس سوال کے مختلف جواب دیتے تھے۔ دنیا کے بنیادی مواد کے متعلق بھی اختلاف تھا، ہاں ذہن کے متعلق عام طور پر وہ یہ کہتے تھے یا تو یہ خالص بھاپ تھا یا لطیف ترین آگ اور یا پھر یہ ہوگا کہ جو کچھ سننے یا دیکھنے میں آتا تھا اس کی تصویر دل کے چاروں طرف کے خون میں آجاتی تھی اور اسی کا نام فکر یا سوچنا تھا۔ پرانا نظریہ یہ تھا کہ لوگ اپنے پردہ شکم سے سوچتے تھے اب متروک ہو گیا تھا بعض اطباء کا خیال تھا کہ شاید اس کا تعلق دماغ سے ہو۔

کئی سال کے بعد سقراط اپنے چند نوجوان دوستوں سے باتیں کر رہا تھا۔ یہ لوگ ایک مسئلہ کا حل تلاش کر رہے تھے اور بار بار ناکامی ہوتی تھی۔ اس نے ان کو متنبہ کیا کہ دیکھنا تم لوگ کہیں "فکر دشمن" نہ بن جانا۔ "فکر دشمن" کا کلمہ اس نے اس شخص کے لئے وضع کیا تھا جو ذہنی کوششوں کی ناکامی کی بنا پر استدلال سے متنفر ہو جائے۔ اس نے کہا کہ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی آدمی

دوسروں پر بے حد بھروسہ کرے اور آ کر ان کا سلوک دیکھ کر مایوس اور برگشتہ ہو جائے (اس کا قول ہے) ''یہ امر بہت افسوسناک ہے کہ وہ شخص جس نے کبھی کسی استدلال کے طریقے کو صحیح سمجھا ہو اور کبھی یہی طریقہ اسے غلط نظر آیا ہو۔ بجائے اپنی بے ہنری کو قصوروار ٹھہرانے کے جھنجھلاہٹ میں استدلال کو موردِ الزام ٹھہرا دے اور تمام غور و فکر سے نفرت کرتا رہے اور اسے برا بھلا کہتا رہے'' سقراط نے اپنے دوستوں سے کہا کہ اس حادثے سے بچنا۔ کیونکہ یہ بہت ہی بری بات ہوگی۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے ذہن میں اس خیال کو راہ بھی نہ دیں کہ استدلال معقول نہیں ہے۔ بلکہ ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہم خود ابھی ذہنی طور پر منظم نہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ جوان مردوں کی طرح معقول و منظم ہونے کی کوشش کریں۔

سقراط کو ''فکر دشمن'' بن جانے کے خطرات کا علم تھا۔ کیونکہ وہ بذات خود اس خطرے سے دوچار ہو چکا تھا۔ ان سالوں میں دانشوروں کے الفاظ اس کے ذہن میں گونجتے رہے تھے۔ ان الفاظ میں سبھی کچھ تھا۔ کہیں اختلاف و تردید کہیں توضیح و تشریح۔ حک و اصلاح۔ سقراط سوچنے لگا تھا کہ اس قسم کی تحقیق و تجسس کے لیے اس کا ذہن موزوں بھی تھا کہ نہیں۔ لوگ اسے عقلمند خیال کرتے تھے۔ لیکن وہ تمام اعلےٰ چیزیں جو اس نے حاصل کی تھیں ان میں سے ایک بات سب سے اہم معلوم ہوتی تھی۔ وہ توضیحات جو دوسروں کو مطمئن کر دیتی تھیں ان سے وہ خود بالکل مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ وہ دائماً یہی محسوس کرتا کہ دانش کا دیار ابھی بہت دور ہے۔

ایک دن اس نے کسی کو انکشا غورث کی کتاب پڑھتے ہوئے سنا۔ بعد میں اسے موقع محل یاد نہیں رہا۔ شاید کسی ورزش گاہ میں چھٹی کے دن شام کو، یا کسی رئیس کے یہاں کھانے کی دعوت میں۔

بہر حال یہ واقعہ جہاں کہیں بھی ہوا ہو۔ ہوا یہ کہ کوئی شخص پڑھ رہا تھا اور وہ سن رہا تھا۔ اب وہ اس منزل پر آ پہنچا تھا کہ کسی مفکر سے بہت زیادہ توقعات وابستہ نہیں کرتا تھا لیکن یہ کتاب ایتھنز میں حال ہی میں آئی تھی۔ کافی ضخیم معلوم ہوتی تھی۔ کاغذوں کے طومار بندھے پڑے تھے۔ سقراط یہ سوچ کر خوش ہوا کہ وہ مخلص سائنس دان جسے ایتھنز والوں کی جہالت نے شہر بدر کر دیا تھا یہاں سے جانے کے بعد فکر اور عمل میں مصروف رہا تھا۔ وہ سوچتا رہا کہ بھلا ستاروں کے متعلق کون سی نئی باتیں دریافت ہوئی ہوں گی۔

کتاب خوب مرتب تھی۔ پہلے ابتدائی اصول بیان کئے گئے تھے اور اشیاء کے آغاز کا ذکر تھا۔ انکشا غورث کا کہنا تھا جو چیزیں ہم دیکھتے ہیں مرکب ہیں۔ سردی میں گرمی ہے۔ کسی شے کو ہم سرد اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں گرمی کے مقابلے میں سردی زیادہ ہے۔ ''سفید چیز میں بھی سیاہی موجود ہوتی ہے'' سقراط نے گردن ہلائی کہ ہاں بات تو یہ سچ ہے، اس نے برف میں سیاہ داغ سے دیکھے تھے اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ پگھلنے کے بعد برف کی سفیدی غائب ہو جاتی تھی۔

قاری پڑھ رہا تھا۔ ''ہر چیز میں دوسری چیزوں کے اجزا شامل ہوتے ہیں لیکن ذہن کی طاقت غیر محدود ہے۔ اس میں کوئی چیز شامل نہیں۔ وہ خود مختار

ہے اور اپنی مثال آپ ہے۔ اختیار کامل رکھتا ہے۔ تمام جانداروں پر، خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، اس کی حکمرانی ہے۔ جو چیزیں شہود میں آنے والی تھیں۔ وجود میں آ گئیں۔ جو آج موجود نہیں ہیں یا موجود ہیں۔ ان سب کو ذہن نے ترتیب دیا تھا"..........

اس کے علاوہ بھی بہت سی باتیں تھیں لیکن سقراط نے گویا اور کچھ سنا ہی نہیں۔ اگر دیوتا اس کے اندر بجلی کی رو دوڑا دیتے۔ تب بھی وہ اپنے باطن میں اتنی روشنی محسوس نہ کرتا۔ آخر اس کی سمجھ میں بھی کچھ تو آیا۔ انکسا غورث نے ہر سوال کا جواب دریافت کر لیا تھا۔ اب ہر بات کی توجیہ کی جا سکتی تھی ایک "ذہانت مطلق تھی۔" جو تمام عالم میں کارفرما تھی اور ہر شے کو مناسب ترتیب دے رہی تھی کیونکہ ذہن تو کام ہی اس طرح کرتا ہوگا۔ اس کے پیش نظر تو ایک اچھے کاریگر کی طرح ہر وقت "اچھائی" ہی رہتی ہوگی۔ اپنے فن سے ناواقف لوہار یا کمہار ہی برے برتن بنا سکتا تھا تو معلوم ہوا کہ ذہن ہر شے کو بہترین طریقے پر وضع کر رہا تھا۔ اس کتاب میں تمام تفصیلات درج ہوں گی۔ انکسا غورث صرف یہی نہیں بتائے گا کہ زمین گول تھی یا چپٹی۔ وہ یہ بھی بتائے گا کہ بہتر یہی تھا کہ اس کی یہ خاص شکل ہو اور اس کے وجود سے بھی بحث کرے گا۔ وہ یہ بھی بتائے گا کہ ذہن کے پاس کون سا نقشہ یا منصوبہ تھا جس کی رو سے تمام چیزیں ترتیب دی گئیں اور جائیں گی۔ اس اہم اور معنی خیز دریافت نے سقراط کو حیران بھی کر دیا۔ لیکن اس کے دل میں ولولے بھی پیدا ہو گئے۔ اب مٹی، ہوا، آگ اور پانی کے متعلق بحث مباحثے نہیں ہوں گے اور لوگ ان کو ہر بات کا

موجب قرار نہیں دیں گے۔ ذہن کے مقابلے میں یہ چیزیں کتنی حقیر معلوم ہو رہی تھیں۔

سننے والے تعریفیں کر رہے تھے "کس قدر دلچسپ! انکشا غورث کی بھی کیا سوجھ بوجھ ہے۔" کچھ لوگ تو اس لئے سن رہے تھے کہ سائنس میں دلچسپی لینا فیشن میں داخل تھا۔ جب کتاب ختم ہوگئی تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ دوسری دلچسپ باتیں چھڑ گئیں۔ جن سے ان کو بھی دلچسپی تھی۔ سقراط نے کتاب اٹھالی اور ایک ایسی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا جہاں وہ اطمینان سے اسے پڑھ سکے۔

ان دنوں لکھنے کا طریقہ بہت خراب تھا۔ ہر لفظ دوسرے سے مربوط تھا۔ پھر بھی اس نے جلدی جلدی ساری کتاب پڑھ لی۔ کتاب کے ختم ہونے سے پہلے اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ جب اس نے پڑھ کر کتاب رکھدی تو اسے اس معاملے میں ذرا بھی شک نہ رہا کہ انکشا غورث بھی بالکل دوسروں ہی کی طرح تھا۔ اس نے بھی دنیا کی توجیہ دوسروں کی طرح مٹی، ہوا، پانی اور آگ کے نظریے کے ذریعے کی تھی۔ تو ان عناصر کے مرکب کو جدا کرنے اور اشیا کو حرکت دینے کے لئے ذہن کا ذکر کر دیا گیا تھا۔

یہ بات بالکل ایسی ہی تھی، جیسے آدمی پانی کے کسی ایسے طشت میں ہاتھ ڈالے جس میں لکڑیاں، پتیاں اور پر سب ایک ساتھ تیر رہے ہوں۔ پھر ہاتھ کو زور سے گھما کر پانی میں چکر پیدا کر دے تو سب چیزیں الگ الگ ہو کر ایک خاص وضع اختیار کر لیں گی۔ کچھ چیزیں گویا چکر کے کنارے جا پہنچیں گی۔ کچھ اس کے درمیان آجائیں گی۔ انکشا غورث کا ذہن وہ ہاتھ تھا جس نے چکر پیدا

بھنور پیدا کیا۔ باقی کام تو بھنور نے کیا تھا۔

سقراط نے کتاب تو اس کے مالک کو واپس کر دی اور بیٹھ کر سوچنے لگا۔ جو بات وہ معلوم کرنا چاہتا تھا اسے نہ پا کر اسے بڑی کوفت سی ہوئی۔ برسوں کے مطالعے کے بعد اب حقیقت بتدریج اس پر روشن ہوتی چلی جاتی تھی۔ سائنس دان مٹی، ہوا، پانی اور آگ کے متعلق شاید ٹھیک کہتے ہوں۔ شاید وہ اس بات کا جواب دے سکیں کہ وہ کیسے وجود میں آئیں۔ لیکن وہ اتنا ہی معلوم کر سکتے تھے۔ وہ اس بات کا جواب دینے سے قاصر تھے کہ ایسا کیوں ہوا۔

کیوں کا تعلق مادہ سے نہیں تھا بلکہ ذہن کی غایت سے تھا۔ سقراط کو یہ بات اس وقت معلوم تھی جب اس نے ماؤس سے باتیں کی تھیں۔ لیکن ایک طرح اس حقیقت کا علم اسے کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ہوا۔ ذہن کی غایت یہی چیز ہے جسے انسان ''اچھائی'' کہتا ہے۔ ''میں یہاں کیوں بیٹھا ہوں''؟ سقراط نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ میں کرائٹو اور دوسرے آدمیوں کے ساتھ باہر کیوں نہیں گیا۔ تاکہ اپنی جہالت کا غم بھول جاؤں اور مزے اڑاؤں۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ کھال اور گوشت کے نیچے ہڈیاں ہیں جو آپس میں جڑی ہیں اور پٹھے ہیں جنہوں نے مجھے یہاں بیٹھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ یا اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے لئے یہی بہتر ہے کہ میں کبھی نہ بھولوں کہ میں جاہل ہوں۔ میں یہاں ٹھہروں اور سوچوں اور حقیقت معلوم کروں۔ پھر چاہے حقیقت کا رخ کسی طرف ہی کیوں نہ ہو ان سوالوں کا جواب صاف تھا۔

یہ ایک شاندار حقیقت تھی جس سے سقراط دوچار تھا اور ایک طرح یہ

حقیقت روح فرسا بھی تھی۔ سقراط اس کے ہر پہلو پر غور کر رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ حیرت انگیز واقعات اور مناظر واصوات کی اس دنیا میں اچھائی کے علم سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ لوگ جس چیز کو اچھا سمجھتے تھے وہی کرتے تھے تو یہ مسئلہ حل ہو گیا کہ ہم کوئی کام کیوں کرتے ہیں۔ جس کام کو لوگ اچھا جانتے تھے۔ وہ کرنے پر بھی مجبور تھے۔ اگر کوئی شخص اپنے پڑوسی کے یہاں چوری کرتا یا جھوٹ بولتا تو محض اس لئے کہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ اس کے لئے اچھا تھا کوئی آدمی جان کر بدی کی طرف نہیں جاتا تھا۔

جہالت بھی کتنی خطرناک چیز تھی یعنی یہ کہ آدمی کو معلوم ہی نہ ہو کہ اچھائی کیا ہے۔ آدمی کا جسم کتنا ہی صحت مند ہو۔ دماغ کتنا ہی روشن ہو۔ اگر اسے اچھائی کا علم نہیں ہے تو وہ تمام عمر غلط راستہ پر سرگرم سفر رہے گا۔ سقراط نے جہالت سے ہمیشہ نفرت کی تھی لیکن اس وقت جہالت کی بدصورتی اسے پہلے سے زیادہ صاف نظر آ رہی تھی۔ اسے یہ سوچ کر بہت افسوس ہوا کہ ایتھنز کے لوگ جو بے حد سمجھدار اور باعمل تھے، اس چیز کے پیچھے دوڑ رہے تھے جو ان کے نزدیک اچھی تھی لیکن جو آخر بری ثابت ہو چکی تھی۔ انہوں نے کبھی اس بات پر غور ہی نہیں کیا تھا۔

لوگ ان چھوٹے چھوٹے اصولوں کے پابند تھے جنہیں انہوں نے بغیر سمجھے سوچے قبول کر لیا تھا۔ ”لڑائی میں کبھی نہ بھاگو“ یا ”فقیروں کو خیرات نہ دو“ یا ”دوست بناؤ شاید ان کی تمہیں ضرورت پڑے“ یا ”زندگی سے جتنا لطف اٹھا سکتے ہو اٹھاؤ۔“ لیکن اچھائی کو جاننے کی کوئی بھی کوشش نہیں کر رہا تھا۔

جمالیاتی زندگی کا مقصد یہی اچھائی تھی۔ اسی سے ہر عمل کا رخ طے ہوتا ہے۔ زندگی کا ہر جز و ایک سوچے سمجھے نقشے کے مطابق مکمل ہوتا ہے جیسے ماہر کوزہ گر کا بنایا ہوا کوزہ۔ سقراط کو معلوم تھا کہ جستجو اس کا اصل کام ہے۔ اچھائی کے علم میں پٹھوں کی کشش سے زیادہ طاقت تھی۔ اس نے اچھائی کے علم کی اہمیت کا جو اندازہ کیا تھا۔ اسی سے اس کی زندگی کی تعمیر ہونے والی تھی۔ ہر چیز کا انحصار اب اسی پر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ راستہ بہت کٹھن ہوگا۔ لیکن سنگ تراش سقراط جو خود کو ایتھنز میں سب سے زیادہ جاہل سمجھتا تھا اور جو سائنس دانوں کے علم اور کاریگروں کے فن کو حقیقی معنوں میں سمجھ ہی نہیں سکتا تھا وہی اس مشکل ترین علم کو حاصل کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ اسے اپنا ذہن اتنی بڑی چیز کے مقابلے میں بہت حقیر معلوم ہوتا تھا۔ سائنس دان اس کی مزید مدد نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بات وہ صاف طور پر سمجھتا تھا۔ وہ دوسرے مسائل پر کام کر رہے تھے۔ وہ ان چیزوں کا مطالعہ کرتے تھے جو محسوس کی جا سکیں۔ لیکن "کیوں" کو سمجھنے کے لئے ایک نئے طریقہ کی ضرورت تھی۔ چاند اور سورج کی رفتار کا مطالعہ بے کار تھا۔ سقراط نے فیصلہ کر لیا کہ اب اس مسئلے کو کبھی نہیں چھیڑے گا۔ انسان کے جسم کا مطالعہ بھی بے سود تھا۔ سقراط کے لئے ہڈیوں اور پٹھوں کا بنا ہوا آدمی موضوع مطالعہ نہیں تھا۔ آدمی اس کے نزدیک ایک ایسا زندہ نظام تھا جو سوچتا تھا، خواہش کرتا تھا اور جس کا تعلق نیکی اور بدی سے تھا۔ آدمی کی "میں" کے لئے کوئی لفظ اب تک موجود نہ تھا۔ سقراط نے ایک لفظ مستعار لیا۔ اگرچہ اس لفظ سے مختلف معنی مراد لئے جاتے رہے تھے لیکن اس نے بڑی جرأت سے کہہ دیا کہ آئندہ میں کلمہ روح استعمال کروں گا (اور معانی وہی ہوں گے۔ یعنی انسان کی شخصیت کی ادائے خاص۔ اسکی میں، انا)۔

دیوتا احکام صادر کرتے ہیں

سقراط آئندہ چل کر جب انکثا غورث کی کتاب کا ذکر کرتا تو اس طرح کرتا جیسے یہ سب کچھ چند لمحوں میں پیش آ گیا ہو لیکن ان دنوں کتاب کا پڑھنا بھی ایک بڑا کام تھا۔ علاوہ ازیں اہم اور معنی خیز فیصلے کرنے سے پہلے ایک خاص طرح کی تربیت ضروری ہوتی تھی۔ سقراط کو اپنے اصل مقصد حیات کو سمجھنے میں کئی سال لگے ہوں گے اور جب سنگ تراشی چھوڑ کر فلسفیانہ زندگی گزارنے کا فیصلہ اس نے کیا ہے تو اس سے پہلے مہینوں وہ چپ چاپ فلسفے کے راستے پر گامزن رہا ہوگا۔

سقراط کے ارادے کی پختگی نے جو افلاطون جیسے دوستوں کو بہت پسند تھی اور اس یقین نے کہ دیوتا اس کے ساتھ ہیں اسی زمانے میں نشوونما پایا ہو گا۔ بعد کے زمانے میں سقراط کو اس بات کا کامل یقین ہو گیا تھا کہ وہ دیوتاؤں کی طرف سے کوئی پیغام لے کر آیا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ عقلمند دیوتاؤں نے اسے دانش کی جستجو کا حکم دیا ہے اور اس بات کے ثبوت میں کریفن کی داستان بیان کرتا تھا۔ کریفن (جیسا کہ ہر شخص کو معلوم تھا) ان پرجوش نوجوانوں میں سے تھا جو ہر وقت سقراط کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ ایک شخص نے اس کا نام چمگادڑ

رکھا تھا کیونکہ وہ دبلا پتلا اور زرد رنگ کا تھا۔ کریفن نے بڑی جرأت سے کام لے کر کہہ دیا تھا کہ سقراط تمام انسانوں سے زیادہ دانا ہے۔ یہاں تک کہ اس نے دیوتاؤں سے درخواست کی کہ وہ اس کا ثبوت مہیا کریں۔ چنانچہ وہ ڈلفی پہنچا تا کہ اپالو کے ہاتف غیبی سے مشورہ کر سکے۔

ڈلفی جہاں اپالو کا مندر بھی تھا اور دارالاستخارہ بھی (ہاتف غیبی کا مقام) ایتھنز کی شمال کی مغربی پہاڑیوں پر واقع تھا اور بہت مقدس گنا جاتا تھا۔ روایات کے مطابق جب دنیا نئی نئی وجود میں آئی تھی زیوس نے آسمان کی مخالف سمتوں سے دو عقاب زمین کی پیائش کے لئے بھیجے۔ دونوں ڈلفی کے مقام پر آ کر مل گئے۔ زمین کے مرکز کا پتھر اس جگہ پر اب تک موجود تھا۔ بعد میں یوں ہوا کہ ایک خوفناک عفریت، جسے اژدہائے زمینی کہتے تھے اسی وادی میں منڈلانے لگا۔ اپالو نے اس اژدہے کو اپنی روپہلی کمان سے مار ڈالا۔ جس مقام پر اژدہا مرا تھا وہاں اپالو نے اپنا متبرک سہ پایہ تخت رکھ دیا اور اپنی ایک پجارن بٹھا دی۔ لوگ اس پجارن سے سوالات کا جواب پوچھنے تمام یونان سے آتے تھے کہ اپالو ایک حق گو دیوتا تھا جو ماضی، حال اور مستقبل سے پوری طرح واقف تھا۔ جو جواب پجارن دیتی تھی سچ ہی ہوتا تھا۔

ڈلفی میں اپالو سے ہر طرح کے سوال پوچھے جاتے تھے۔ شہروں سے سفیر یہ پوچھنے آتے تھے کہ طاعون سے کس طرح نجات حاصل کی جائے یا نئی آبادی کس جگہ قائم کی جائے۔ اہم شخصیتیں یہ پوچھنے آتی تھیں کہ اولاد سے ان کا نام چلے گا یا نہیں۔ یہ بات صرف یونان کے شہروں ہی تک محدود نہیں تھی بلکہ

زمانہ قدیم میں مشرق کے بادشاہ بھی پوچھتے رہتے تھے کہ جنگ کریں یا نہ کریں یا کس کو اپنا شریک کار بنائیں۔

ہاتف غیبی کا جواب ہمیشہ صحیح نہیں ہوتا تھا (ہاں یہ اور بات ہے کہ موقع پا کر پجاری کا نقرات میں مناسب ترمیم کر لیں۔ پھر بھی اکثر صحیح ہوتا تھا۔ جب تک یونانیوں کا دیوتاؤں پر اعتقاد رہا ان کی اکثریت ڈلفی کے ہاتف غیبی کی بھی معتقد رہی۔ بوڑھے ہو جانے پر بھی سقراط نے اپنے ایک نوجوان دوست کو جو ایک خطرناک مہم پر روانہ ہونے والا تھا۔ مشورہ دیا کہ وہ جانے سے پہلے اپالو کی رائے معلوم کر لے۔ فارقلیس کا ایک نامی گرامی دوست تھا جو کمانڈار تھا۔ مدبر تھا۔ سلطنت کا خزانچی تھا اور مشہور شاعر بھی تھا۔ اس کا نام سوفکلیز تھا۔ اس نے اپنے ڈراموں میں ثابت کیا ہے کہ اپالو کی بات ہمیشہ سچ نکلتی تھی اور ہاتف غیبی کی باتوں پر شک کرنا گویا الحاد تھا۔

اسی بنا پر کریلس بھی اپنے سوال کا جواب لینے ڈلفی گیا۔ وہ دوسرے زائرین کے ہمراہ کورنتھ سے جہاز پر گیا۔ یا شاید خشکی کے اس راستے سے گیا جو پہاڑوں پر چکر کاٹتا ہوا بیوشیا سے ہو کر گزرتا تھا۔ اگرچہ اب اس کی جوانی کا عالم تھا لیکن اس نے ہاتف غیبی کا ذکر بچپن ہی سے سن رکھا تھا۔ جب وہ پہاڑ کا موڑ کاٹ کر اوپر پہنچا اور اس متبرک مقام کو پہلی بار دیکھا تو حیرت و استعجاب سے اس کی سانس ہی گویا رک گئی۔ عمودی چٹیل پہاڑ کی گود میں ڈلفی کا مندر بڑا جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ سونے، سنگ مرمر اور برونز پر شعاعوں کی چھوٹ پڑ رہی تھی۔ زائرین کی صدائیں برابر بلند ہو رہی تھیں۔ ڈلفی پہنچ کر اپالو دیوتا کی

عظمت کا احساس ہوتا تھا۔

مندر میں داخل ہونے سے پہلے کریفن کو کچھ دن انتظار کرنا پڑا۔ زائر دیوتا کے سامنے اپنی باری آنے پر حاضر ہوتے تھے اور سوالات پروہت کو کافی پہلے پہنچا دیئے جاتے تھے۔ آخر کار کریفن کی باری بھی آ گئی۔ اس نے باقاعدہ نذر پیش کی اور سنگ مرمر کے دالانوں میں سے گزرتا ہوا اس اندھیرے روضہ میں پہنچا۔ جہاں زمین کا متبرک مرکزی پتھر اپالو کے مقدس سہ پایہ تخت کے برابر رکھا تھا۔

سوال پوچھا گیا تو اس کا جواب پجارن نے اس طرح چیخ چیخ کر دیا کہ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اپالو پجارن کے ذریعہ جواب دے رہا تھا لیکن پروہتوں کے سوا اور کوئی سمجھ نہ سکتا تھا۔ اس کا سوال تھا۔ "ایتھنز میں کوئی آدمی سقراط سے زیادہ عقلمند ہے"؟ عام طور سے جواب پیچیدہ اور معمے کی شکل میں ہوا کرتا تھا لیکن اس سوال کا جواب بالکل صاف الفاظ میں تحریر تھا۔ "کوئی شخص اس سے زیادہ عقلمند نہیں ہے۔" چنانچہ اس خبر کو دوستوں تک پہنچانے کے لئے وہ تیزی سے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

ایتھنز پہنچ کر جب کریفن نے لوگوں کو اپالو کا جواب بتایا تو لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے لگے۔ پارسا لوگوں نے کہا کہ دیوتا کی بات کو اہمیت دینی چاہیے۔ پھر انہیں میں سے اکثر لوگ تو پہلے کی طرح سقراط سے بات کرنے سے بھی کترانے لگے۔ متشککین نے کہا کہ ہاتف غیبی کی بات ہمیشہ صحیح نہیں ہوتی۔ اپنی بات کے ثبوت میں ان لوگوں نے جنگ فارس کے زمانے

کی پیشگوئیاں یاد دلانا شروع کر دیں اور کہا کہ آج کل تو ڈلفی اسپارٹا پر مہربان ہے اور پھر یہ بات بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ پجارن کو رشوت بھی تو دی جا سکتی ہے اور پروہت بھی تو آخر کار انسان ہوتے ہیں۔

سقراط نے بذات خود اس بات پر بہت کم رائے زنی کی۔ اس کا خیال تھا کہ اپالو کے جواب سے سقراط جس طرح شخصاً توجہ کا مرکز بن گیا تھا یقیناً اپالو بھی اسے پسند نہ کرتا ہوگا۔ جب لوگوں نے اس سے پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ دیوتا نے میرا نام مثال کے طور پر استعمال کیا ہوگا۔ ہاتف غیبی کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی اپنے جہل سے واقف ہے وہی عقل مند ہے۔''

سقراط یہی کہتا تھا کہ ہاتف غیبی نے اس کا نام مثال کے طور پر لیا تھا۔ پھر بھی نام تو لیا گیا تھا اور شاید اس طرح اسے کوئی پیغام بھیجا گیا تھا۔ اس نے ہاتف غیبی کے پیغام کا یہ مطلب سمجھا کہ دیوتا کہتا ہے کہ تمہارے ذمے کوئی کام لگایا جائے گا۔ حکم کی تعمیل کرنی ہوگی۔ بچپن میں بھی وہ نشان ربانی کی تعبیر اس طرح کیا کرتا تھا (غرور اور توہم پرستی سے بچ کر) سقراط نے خود تو کوئی سوال نہیں کیا لیکن کسی کے سوال کے جواب میں دیوتا نے یا ہاتف غیبی نے کچھ باتیں کی تھیں۔ جو سب شہر والوں کو معلوم تھیں۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ دیوتا سقراط کو کسی قسم کی قومی خدمت سپرد کرنا چاہتے تھے۔ دیوتاؤں کا منشا یہ تھا کہ سقراط صداقت کی جستجو کرے لیکن یہ نہ سمجھے کہ اس میں صرف اس کا ذاتی مفاد مخفی ہے۔ بلکہ یہ تصور کرے کہ اس جستجو میں قوم کی بھلائی ہے۔

ہاتف غیبی کے جواب سے سقراط کی روح میں دیوتاؤں سے قرب کا

جو احساس پیدا ہو گیا تھا اسے ملحوظ رکھیں تو اس زمانے کی ایک دوسری عجیب و غریب بات کی توجیہ ممکن ہے۔

شمال میں پوٹیڈیا کے محاصرہ کے موقع پر سقراط دوبارہ فوجی خدمت انجام دے رہا تھا۔ اس کی زندگی کے ان درمیانی سالوں میں کئی لڑائیاں ہوئیں۔ اس کے ساتھیوں نے کبھی سردی، بھوک یا طویل سفر سے اسے پریشان ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اب فوج کے کماندار بھی سمجھ گئے کہ سقراط ایک بہادر سپاہی ہے۔ جب لوگ اپنے پیروں پر نمدا یا اُون لپیٹ لیتے یا کمروں کے اندر بیٹھے رہتے۔ سقراط سردی یا گرمی کے احساس سے بے نیاز اپنا لبادہ اوڑھے ننگے پیر باہر گھومتا پھرتا تھا اور اس لڑائی میں تو ایک بار وہ اپنی جان پر کھیل کر ایک زخمی دوست کی جان بچانے کے لئے فوج کے سامنے کھڑا رہا۔ اس کے دوست کا نام السی بیاویز تھا۔ یہ شخص سقراط کی تمثیل حیات میں ایک اہم کردار ادا کرنے والا تھا۔ (لیکن یہ داستان اور ہے) اس وقت جس عجیب و غریب واقعہ کا ذکر کیا جا رہا ہے اسے مہموں، جنگوں یا دوستوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کا تعلق سقراط اور اس کے ذہن سے ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ گرمیوں کی ایک صبح کو وہ اپنے خیمہ میں تھا۔ سردیوں کے مصائب ختم ہو چکے تھے (فوجوں کو رسد پہنچانے اور گرم رکھنے کے مسائل) دشمن خاموش تھا۔ جو شخص پہرے پر مامور تھے ان کے سوا دوسروں کے لئے سونے، گھر کی باتیں کرنے یا کھیلنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں تھا۔

سقراط اس دن پہلی بار گفتگو میں شریک نہیں ہوا۔ شاید لوگوں کو تعجب

ہوا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ لیکن دوپہر تک کسی نے اس طرف خاص طور پر توجہ نہیں دی۔ پھر ایک افواہ پھیل گئی اور سقراط کے خیمے کے نزدیک متجسس سپاہیوں کی بھیڑ لگنے لگی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ سقراط صبح سے وہاں ایک ہی حالت میں کھڑا تھا۔ اس کے پاؤں زمین پر مضبوطی سے ٹکے تھے اور اس کا لبادہ کندھوں پر تھا۔ اس کے بدصورت چہرہ سے یوں ٹپکتا تھا جیسے وہ بڑے انہماک سے دور دیکھ رہا ہے۔ اس کی تمام طاقتیں اس کی فکر میں مجتمع ہو گئی تھیں۔

سپاہیوں نے اپنے کرتبوں کے ذریعے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اس کا لبادہ پکڑ کر کھینچا اور اسے پکارا بھی لیکن اس نے نہ تو کوئی حرکت کی اور نہ ہی ان کی طرف دیکھا۔ جب انتظار کرتے کرتے وہ تھک گئے تو ان میں سے اکثر لوگ چلے بھی گئے۔ کچھ لوگ شام تک بیٹھے سقراط کے جاگنے کا انتظار کرتے رہے۔ گویا وہ سویا ہوا تھا۔

ایتھنز کے بیشتر لوگ اب سقراط سے واقف ہو گئے تھے۔ شاید وہ لوگ اس سے پہلے بھی اسے اسی طرح گہری فکر میں ڈوبا ہوا دیکھ چکے تھے لیکن اتنی طویل مدت تک کے لئے نہیں۔ وہ اس کے اس انوکھے پن کے عادی ہو چکے تھے لیکن جو یونانی جزائر سے آئے تھے اور فوج میں شامل تھے، انہوں نے اس واقعہ میں بہت دلچسپی لی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد ان میں سے اکثر تو اپنی چٹائیاں لے کر وہیں پر رات بسر کرنے کو آ گئے۔ جہاں سقراط کھڑا ہوا تھا۔

رات بڑی پرسکون تھی۔ تمام آسمان پر ستارے چمکنے لگے اور ان کا سست رفتاری کا سفر شروع ہو گیا۔ رفتہ رفتہ پورے کیمپ میں خاموشی ہو گئی۔

دیکھنے والوں کو سقراط اپنے اور ستاروں کے درمیان بالکل یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ایک ساکت مجسمہ، کسی درخت کا ٹھونٹ یا کوئی پتھر۔ ان کی آنکھیں بوجھل ہو کر بند ہو گئیں اور وہ سو گئے۔ سقراط تمام رات اسی طرح کھڑا سوچتا رہا یہاں تک کہ شبنم گرنے لگی اور صبح ہو گئی۔

سورج کے نکلتے ہی اس کے جسم کو بھی حرکت ہوئی۔ وہ چند لوگ جو وہاں موجود تھے اور اسے دیکھ رہے تھے انہوں نے اس کو مشرق کی طرف گھومتے دیکھا۔ اس نے سورج کی طرف دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور پھر اپنے روزانہ کے معمولات میں مصروف ہو گیا۔

سقراط کیا سوچ رہا تھا یہ بات کسی کو معلوم نہیں کیونکہ اس نے کبھی کسی کو یہ بات بتائی ہی نہیں لیکن بہت دنوں کے بعد یہ بات دیکھی گئی کہ جب کبھی سقراط اپنی زندگی کے متعلق اس طرح بات کرتا جیسے دیوتاؤں نے اسے کسی خاص کام کی تکمیل کے لئے بھیجا ہو۔ تو وہ اپنا مقابلہ ایک ایسے سپاہی سے کرتا جو کسی کام پر متعین کیا گیا ہو۔ جو کام اس کے ذمہ تھا اس کے متعلق قطعی یقین اسے شاید اس زمانے میں حاصل ہوا۔ جب وہ فوج میں تھا یا شاید اس ایک رات اور ایک دن کی خاموش فکر میں جس کا ذکر ابھی کیا گیا۔ دیوتاؤں سے یہ خاص قربت شاید اس نے اسی وقت محسوس کی ہو تبھی تو جاگتے ہی وہ عبادت میں مصروف ہو گیا۔

ایتھنز کے لوگ باقاعدہ سورج کی پرستش نہیں کرتے تھے۔ نہ چڑھاوے چڑھاتے تھے اور نہ اس کا کوئی ثبوت ہے کہ سقراط نے سورج کی

بحث کی۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ وہ جہل کی تاریکی سے نفرت کرتا تھا۔ اسے نیکی کے صاف اور روشن ادراک سے محبت تھی۔ اس کا شاگرد افلاطون ابھی پیدا نہیں ہوا تھا لیکن وہ سقراط کو دوسرے دوستوں کی نسبت بہتر جانتا اور سمجھتا تھا۔ جب اس نے نیکی کے اس تصور کو بیان کرنے کی کوشش کی جس کی سقراط کو جستجو تھی تو اس نے اپنے خیال کی وضاحت کے لئے سورج کی علامت استعمال کی۔

ہمارے قیاسات کے مقابلے میں افلاطون کی پیش کی ہوئی تصویر سقراط کے خیالات کی غالباً بہتر وضاحت کر سکتی ہے۔

اس نے کہا "تصور کرو کہ انسان کسی زمین دوز غار میں رہتے ہیں۔ وہاں وہ بچپن سے زنجیروں میں جکڑے پڑے ہیں۔ انہوں نے اگر کوئی روشنی دیکھی ہے تو وہ اس آگ کی ہے جو سامنے کی دیوار پر متحرک سائے پیدا کرتی ہے۔ وہ تمام دن ان سایوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ یہی دیکھتے رہتے ہیں کہ وہ کیسے ہیں اور کس طرح حرکت کرتے ہیں۔ ان میں سے جو لوگ ان سایوں کے متعلق قیاس آرائی کرنے میں بہت ماہر ہیں وہ بہت ہی قابل تعریف سمجھے جاتے ہیں۔

"اب فرض کرو کہ ان میں سے کوئی قیدی کسی طرح آزادی حاصل کر لیتا ہے اور غار سے باہر نکل کر سورج کی روشنی میں پہنچ جاتا ہے۔ یکبارگی تیز روشنی میں پہنچ کر اس کی نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی۔ شاید وہ ان حقائق کو جنہیں وہ کہ پہلی دفعہ اپنے چاروں طرف دیکھ رہا ہے، ان سایوں کے مقابلے میں کم اہمیت سمجھے گا۔ جب رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں سورج کی روشنی کی عادی ہو جائیں گی

تو وہ اپنے چاروں طرف دیکھ سکنے کے قابل ہو جائے گا۔ پانی میں انسان کی پرچھائیں کے بجائے اسے انسان دکھائی دے گا۔ اسے چاند اور ستارے نظر آئیں گے اور پھر وہ سورج کا مشاہدہ کرے گا جو زندگی اور نور عطا کرتا ہے۔ اب وہ روشنی سے ڈرنے کے بجائے اس سے محبت کرے گا۔ اب اسے غار کی تاریک زندگی اچھی معلوم نہ ہو گی۔"

"اگر اس آزاد شخص کو دوبارہ قیدیوں کے ساتھ غار میں رہنے کے لئے بھیج دیا جائے تو اس پر کیا گزرے گی۔ اس کی آنکھوں میں روشنی تو پھر بھی رہے گی لیکن وہ سایوں کو اچھی طرح پہچان سکے گا اور اس کے ساتھی قیدی اس پر ہنسیں گے۔ وہ کہیں گے کہ جب وہ باہر گیا تھا تو اسے دکھائی دیتا تھا اب وہ اندھا ہو کر واپس آیا ہے وہ کہیں گے کہ غار سے باہر نہ نکلنا ہی بہتر ہے وہ قانون بنا دیں گے کہ اگر کوئی شخص کسی قیدی کو آزاد کرانے اور اسے باہر روشنی میں لے جانے کی کوشش کرے گا تو اسے ہلاک کر دیا جائے گا۔ جہاں تک اس شخص کا تعلق ہے جس نے سورج کو دیکھا ہے اگر اسے کسی قانونی عدالت میں یا کہیں اور اپنی بے گناہی ثابت کرنا ہو تو ممکن ہے کہ وہ عجیب و غریب حرکتیں کرے اور لوگ اس پر ہنسیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی آنکھیں لبریز نور ہیں اور اسے سابقہ ان لوگوں سے پڑ گیا ہے جو صرف پرچھائیوں سے واقف ہیں۔"

جب افلاطون سورج اور غار کی یہ داستان بیان کر رہا تھا تو اس نے بصراحت یہ نہیں کہا کہ میرے خیال میں سقراط ہی وہ شخص ہے جس نے سورج دیکھا ہے۔ خود سقراط نے کہا ہے کہ میں اچھائی کی جستجو کرتا ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا

کہ میری جستجو ختم ہو گئی ہے۔ ہم کو جو کچھ معلوم ہے وہ صرف اتنا ہے کہ سقراط کے دوست کریٹن افلاطون اور بہت سے دوسرے لوگ یہ محسوس کرتے تھے کہ عام لوگوں کے مقابلے میں سقراط نے غار کی تاریکی سے یوں نجات حاصل کی تھی کہ وہ اوروں کو بھی نجات دلانے کے لائق ہو گیا تھا شاید اس دن اور رات جب وہ اتنی طویل مدت تک کھڑا سوچتا رہا۔ اس نے سورج کو بہت ہی نمایاں طور پر دیکھا ہو وہ سورج اچھائی کا تھا اور اس کی روشنی میں وہ دیوتاؤں کے بہت قریب ہو گیا تھا۔ ہم فرض کر سکتے ہیں کہ شمال کی مہم سے لوٹنے کے کچھ عرصے بعد سقراط وہ تبدیلیاں عمل میں لایا جن پر وہ برسوں سے غور کر رہا تھا۔ اس نے سنگ تراشی کا کام ختم کر دیا۔ اس کی جوان بیوی زن ٹیپی فطری طور پر کافی پریشان ہوئی اور اس نے ہمسایوں سے شکایت کی ۔ حالت ابھی بہت خراب نہیں ہوئی تھی۔ شادی میں وہ اپنے ساتھ کافی جہیز لائی تھی اور پھر سقراط کے والدین نے بھی ایک مکان اور کچھ رقم ترکہ میں چھوڑی تھی۔ سقراط نے یہ رقم کرائٹو کو تجارت میں لگانے کے لئے دے دی تھی اور اس کی آمدنی سے وہ سادہ زندگی گزار سکتے تھے۔ لیکن زن ٹیپی کا خیال تھا کہ زندگی زیادہ آرام سے گزرتی اگر اس کا شوہر دوسرے آدمیوں کی طرح ہوشمند ہوتا۔

کرائٹو نے، جو سقراط سے زن ٹیپی کے مقابلے میں زیادہ واقف تھا، ایک اور بات دیکھی جس نے اسے متفکر کر دیا۔ سقراط اپنے آپ کو کسی مقابلے کے لئے تیار کر رہا تھا اور اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا۔ کرائٹو اپنے زمانے میں کھلاڑی رہ چکا تھا لہٰذا اس نے متعلقہ علامات فوراً پہچان لیں۔ اس تیاری نے

سقراط کی خوراک اور اس کے سونے کے اوقات کو بھی متاثر کیا۔ جس طرح ایک دوڑنے والا اپنی زندگی کو اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ یہ چیزیں اس کے دوڑنے میں مخل نہ ہوں۔ یہی عالم سقراط کا بھی تھا۔ شکم سیر ہو کر کھانے کے بعد نیند کا جو غلبہ ہوتا ہے اور شراب پینے کے بعد جو حماقت آمیز جوش و خروش پیدا ہوتا ہے وہ اس سے پرہیز کرنے لگا۔

لیکن عام طور سے جو مقابلے ہوتے ہیں یہ مقابلہ ویسا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اگرچہ سقراط ان دنوں دوپہر کے بعد ورزش گاہ میں رہتا تھا لیکن وہ دوڑنے یا کشتی لڑنے کے بجائے باتوں میں مشغول رہتا۔ اسے باتیں کرنے کا ہمیشہ سے شوق تھا لیکن اب تو وہ اتنی سنجیدگی سے باتیں کرتا پھرتا تھا جیسے کوئی شخص اپنا فرض منصبی پورا کر رہا ہو۔ وہ سورج نکلتے ہی گھر سے نکل کھڑا ہوتا اور تمام دن بازار یا ورزش گاہ میں باتیں کرتا رہتا۔ آخر اس کا مقصد کیا تھا؟

ایک بات دیکھ کر کرانٹو کو البتہ خوشی ہوئی۔ سقراط کا مقصد کچھ ہی کیوں نہ ہو اسے نقصان پہنچنے کا خدشہ کوئی نہیں نظر آتا تھا۔ لطیفوں اور ہنسی مذاق کی نزاکتیں وہ اب بھی بھانپ لیتا تھا۔ اس میں خود پسندی نہیں تھی اگر یہ خطرہ کبھی تھا تو ان دنوں تھا جب وہ سائنس کی طرف متوجہ تھا لیکن اب وہ خطرہ رفع ہو چکا تھا۔ دوستوں کے حق میں اب وہ پہلے سے زیادہ مخلص اور اچھا رفیق تھا۔ پہلے کبھی کبھی وہ ایک دم غصے میں آپے سے باہر ہو جاتا تھا لیکن اب تو اسے غصہ آتا ہی نہیں تھا۔ پہلے جیسا تلون اور بے قراری بھی اب موجود نہ تھی۔ کرانٹو دیکھتا تھا کہ اکثر اوقات تو سقراط پر ایک عجیب و غریب سکون طاری ہوتا تھا ایسا معلوم

ہوتا تھا جیسے ایتھنز کے تمام لوگوں میں صرف اسے معلوم ہے کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور وہ بہرحال پابہ رکاب تھا۔

مقصدِ حیات

یوں کہنا چاہیے کہ جب سقراط ادھیڑ عمر کا ہوا تو اس نے اپنے مقصد کی تکمیل کی مہم شروع کی۔ اس مہم کو عمر بھر جاری رہنا تھا۔ وہ اپنے مقصد کی وضاحت کئی طرح سے کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا میں دیوتاؤں کا ایک سپاہی ہوں جسے اپنی جگہ پر ڈٹا رہنا چاہیے۔ میں ڈنک مارنے والی بڑ مکھی ہوں جسے دیوتاؤں نے شہر میں ہلچل پیدا کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ ایک طبیب ہوں اور دوسروں کے افکار کو اس طرح جنم دیتا ہوں اور پیش کرتا ہوں جس طرح ماں بچے کو جنم دیتی ہے اور پیش کرتی ہے۔ وہ کہتا تھا کہ میں لوگوں کو اُن کے مخصوص طرز زندگی کی وضاحت کرنے کی ترغیب دیتا ہوں۔ میں ان کا امتحان لیتا ہوں یا یہ کہ میں فلسفہ آرائی کرتا ہوں۔ فلسفہ آرائی سے اس کی مراد یہ تھی کہ میں اپنے طرز عمل سے ثابت کر رہا ہوں کہ مجھے دانش سے محبت ہے۔

ابتدا میں اس نے اپنی جستجو کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ سمجھی ہو لیکن اب تو اس کا تعلق سراسر عوام الناس سے تھا۔ یعنی اب صداقت کی جستجو سے جہاں ذاتی مفاد ملحوظ تھا وہاں اتنا ہی عوام الناس کا فائدہ بھی مطلوب تھا۔ نیکی کا ادراک جس کی تلاش تھی، ہمیشہ اس سے دور رہا۔ لیکن اسے اس کی موجودگی کا علم ہو گیا تھا

اور وہ ہر طرز زندگی کو اسی طرف لے جانا چاہتا تھا۔ اس کے پڑوسی جن سے اس کو محبت تھی نہ صرف یہ کہ جو وہ دیکھ رہا تھا اسے دیکھنے سے قاصر تھے۔ بلکہ غار کے قیدیوں کی طرح وہ اندھے پن پر قادر تھے اور سمجھتے تھے کہ یہی بصارت ہے۔ افلاطون نے غار کی جو تصویر کھینچی ہے۔ اگر اسے ذہن میں رکھا جائے تو یہ سمجھنا بہت آسان ہو جائے گا کہ سقراط کا شہریوں کی اس زندگی کے متعلق کیا خیال تھا۔ جو حماقت سے لبریز تھی اور جو پرچھائیوں پر لپکتی تھی۔ افلاطون کے بیانات ہی کی روشنی میں یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ سقراط کے خیال میں دیوتاؤں کا منشا کیا تھا اور وہ اس زندگی میں کسی قسم کا تغیر چاہتے تھے۔

پرچھائیوں کے شیفتہ ہونے کے باوجود ایتھنز کے لوگ شجاع اور بہادر تھے۔ آزاد تھے۔ ان کا شہر شاندار تھا اور حیرت انگیز۔ سقراط کو اس شہر سے بے پناہ محبت تھی، اور وہ کسی طرح بھی اس بات پر آمادہ نہ ہوتا تھا کہ ایک دن کے لئے بھی اس شہر کو چھوڑ کر چلا جائے۔ شہر میں جو معرکہ کے کام ہوتے تھے سقراط کو دوسرے لوگوں کی نسبت ان کا علم زیادہ ہوتا تھا۔ کاریگر کسی نگراں کی عدم موجودگی میں بھی ایمانداری سے کام کرتے تھے۔ دوست دوستوں کے وفادار تھے۔ تاجر اپنے وعدے کے پکے تھے اور شہری ایوان میں ہمیشہ اس بات کی حمایت کرتے تھے جسے وہ صحیح سمجھتے تھے۔

شہر کا اچھا ہونا ہی سقراط کے اضطراب کا باعث تھا۔ وہ کہتا تھا کہ کیسی اچھی باتیں ہوتی ہیں لیکن ہمیشہ ہی اچھی بات کیوں نہیں ہوتی اور اسے اس بات کا بھی رنج تھا کہ اچھی بات ہوتی ہے تو بھی کرنے والے کو اس کا شعور نہیں

ہوتا۔ لوگ نیکیاں گویا غلطی سے کر جاتے تھے یہ سمجھ کر نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اسی طرح بغیر جانے ہوئے وہ دوسرے لمحے میں برائی بھی کر سکتے تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اپنی نیکیاں اپنے بچوں تک منتقل نہیں کر پاتے تھے۔ مثال کے طور پر فارقلیس کے بچوں کو دیکھو اس کے بچے عام بچوں کے مقابلے میں بہتر تو کیا بدتر ہی ہوں گے۔ یا تو فارقلیس اپنے بچوں کی پروا نہیں کرتا تھا یا پھر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ ان میں صفات کیسے پیدا کرے جن کی وجہ سے خود وہ ایک بڑا آدمی ہو گیا تھا۔

سقراط نے دیکھا کہ پیشہ ور استاد بھی کچھ اچھے نہ تھے۔ وہ عام آدمیوں سے کچھ مختلف نہیں تھے۔ سوائے اس کے کہ ان کو مقابلتاً زیادہ چیزوں کا علم تھا اور وہ تقریر کرنے میں ماہر تھے۔ سوفسطائی یا ''دانا مفکرین'' جو ان میں سے بہت زیادہ مشہور تھے اور جو نیکی اور کامیاب زندگی کے فن کی تعلیم دینے کا دعویٰ کرتے تھے۔ ان کو خود ان باتوں کا حقیقی علم حاصل نہیں تھا جنہیں وہ پڑھاتے تھے۔

سقراط نے معمولی سے معاوضہ کے بدلے کچھ دنوں ایک سوفسطائی سے بھی درس لیا۔ اس گروہ کے بہت سے افراد سے باتیں کیں اور پھر ان سے کچھ سیکھنے کا خیال اسی طرح ترک کر دیا۔ جیسے اس نے سائنس دانوں سے کچھ حاصل کرنے کا خیال ترک کر دیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ نیکی کے ماہر وہ لوگ نہیں ہیں جو نیکی کی تعلیم دیتے ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو خود نیک ہیں۔

سقراط جہاں بھی جاتا ماہر کی تلاش کرتا۔ وہ لوگوں سے اچھائی یا نیکی کی نہیں صورتوں کے متعلق سوال کرتا جن کے متعلق ان کی مہارت مسلم گردانی جاتی تھی۔ اس سے دونوں کو فائدہ ہوتا۔ سقراط کو اپنی جستجو میں مدد ملتی اور ماہروں کو بھی کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچ ہی جاتا۔

سقراط کی طرح سوال پوچھنے والا آج تک کوئی نہیں گزرا اور اس کے سوالات کے اسلوب پر غور کرنا بہت دلکش ہے۔ مثال کے طور پر لاکیز سے جو اس کی گفتگو ہوئی ہے اس پر غور کیجئے۔ افلاطون نے سقراط کے جو مکالمات قلم بند کئے ہیں وہ سب غور سے پڑھنے کی چیزیں ہیں۔ لیکن لاکیز والا مکالمہ آغاز ہی کا کام اچھی طرح انجام دے سکتا ہے۔ لاکیز کچھ بہت ہوشیار آدمی نہیں تھا لیکن اس نے جس نیکی یا اچھائی کے متعلق سقراط سے گفتگو کی اس سے ہر شخص واقف ہے یعنی دلاوری۔

سقراط کا معمول تھا کہ وہ سوال کرنے کے لئے صحیح آدمی منتخب کرتا۔ لاکیز ایتھنز کا ایک مشہور کماندار تھا۔ وہ دوسروں کی طرح سیاست دان نہیں تھا۔ بلکہ اس نے جنگ کو اپنا کاروبار بنا رکھا تھا۔ اگر دنیا میں کسی چیز سے وہ واقف تھا تو وہ فنون جنگ تھے۔ کچھ دوستوں نے اس سے اور اس کے ساتھی کماندار نیسی اس سے اپنے بچوں کی فوجی تربیت کے بارے میں رائے پوچھی تھی اور انہوں نے سقراط کو اپنی مدد کے لئے بلایا تھا۔

کماندار اپنے دوستوں اور دوستوں کے بچوں کے ساتھ ورزش گاہ میں کوئی کھیل دیکھنے آئے تھے۔ زرہ بند فوجوں کی لڑائی کا ایک استاد نئے شاگرد

حاصل کرنے کے لئے اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ لاکیز اور نیسی اس نے دیر یہ تماشا دیکھا اور پھر آپس میں بحث کرنے لگے کہ اس طرح کی تربیت امر جنگ میں مفید ہو گی یا نہیں۔

نیسی اس کا خیال تھا کہ مفید ہو گی۔ لاکیز اس سے متفق نہیں تھا۔ اس نے کہا" جہاں تک مظاہروں کا تعلق ہے میں نے اسی شخص کو کچھ دن ہوئے اسی طرح کے کرتب دکھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ پہلے میرے سپاہیوں میں تھا۔ جہاز پہ یہ اپنا تیار کیا ہوا نیزہ لے کر آیا جو درانتی کی طرح خم کھائے ہوئے تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بہت کارآمد ہو گا۔ قصہ مختصر یہ کہ جب ہم لڑتے ہوئے دشمن کے جہاز کے برابر سے گزرے تو وہ دشمن کے جہاز کے ایک مستول میں پھنس گیا۔ اس نے اسے کھینچا لیکن اسے علیحدہ نہ کر سکا۔ یہ شخص دستہ پکڑے پورے عرشے پر دوڑتا پھرا۔ آخر کار کسی نے اس کے پیر پر پتھر مارا۔ تو یہ نیزہ چھوڑ کر بھاگا اور اس کی یہ حالت دیکھ کر دونوں جہازوں کے سپاہی ہنسنے لگے۔ ہم کیا کر سکتے تھے۔ تم بھی اگر مستول میں نیزے کو لٹکتا دیکھتے تو ہنسے بغیر نہ رہ سکتے۔ لاکیز اس قصے کو یاد کر کے ہنس رہا تھا۔ اس نے کہا" میں سنجیدگی سے کہتا ہوں کہ یہ استاد اپنی میکانکی مہارت اور ایجادات کے باوجود کسی کام کا نہیں ہے۔ سقراط تمہارا کیا خیال ہے؟ ہم میں سے ایک اس کا حامی ہے دوسرا مخالف۔ تمہاری رائے فیصلہ کن ہو گی۔"

سقراط کو یہ بات کبھی پسند نہ آتی تھی کہ صحیح اور غلط کا فیصلہ آراء کی گنتی سے کیا جائے۔ اس نے مشورہ دیا۔" یہ مسئلہ تمہارے دوستوں کے بچوں کی تعلیم

کا ہے اور اس لئے کافی اہم ہے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم کسی ماہر کو تلاش کریں اور اس سے مشورہ لیں۔"

بات کافی معقول معلوم ہوئی۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ ماہر کس شے میں ماہر ہو؟" سقراط نے پوچھا۔

"

"ہم زرہ بند فوجوں کی لڑائی کے مسئلہ پر غور کر رہے ہیں اور سوال یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو یہ فن سیکھنا چاہیے کہ نہیں۔" نیسی اس کی یہ بات بہت معقول تھی۔

سقراط نے کہا "لیکن ایک دوسرا سوال ہے جسے پہلے طے کر لینا چاہیے۔ مثال کے طور پر جب ایک آدمی آنکھ میں دوا ڈالنے کے متعلق پوچھتا ہے تو اسے آنکھ سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے یا دوا سے۔"

"آنکھ سے" نیسی اس نے جواب دیا۔

"اور جب وہ سوچتا ہے کہ گھوڑے کے منہ میں لگام دی جائے کہ نہیں تو وہ یقینی طور پر گھوڑے کے متعلق سوچ رہا ہے لگام کے متعلق نہیں۔"

"درست ہے" نیسی اس نے کہا۔

"تو پھر نیسی اس! تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ زرہ بند ہو کر لڑنے کا علم بالکل دوا یا لگام کی طرح ایک مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ جب ہم علم کی مختلف اقسام کا ذکر کرتے ہیں اس وقت درحقیقت ہم اپنے نوجوانوں کے متعلق سوچتے ہیں۔ اس تربیت سے نوجوانوں کی ذات یا ان کی روح متاثر ہوگی۔

ایک طبیب ہی جانتا ہے کہ آنکھوں کے لئے کیا مفید ہے اور ایک چابک سوار ہی یہ جانتا ہے کہ گھوڑے کے لئے کیا بہتر ہوگا۔ لیکن ہم میں سے یہ کون جانتا ہے کہ روح کے لئے کیا بہتر ہوگا اور یہی اصل سوال ہے۔"

نیسی اس نے ہنس کر کہا کہ "میں اس بات کا منتظر تھا۔" وہ پہلے بھی سقراط سے گفتگو کر چکا تھا اور متوقع امتحان کے لئے بالکل تیار تھا۔

"لیکن لاکیز تمہارا کیا خیال ہے بات کرتے وقت خبردار رہنا۔"

لاکیز نے جواب دیا کہ "میں اس شخص سے بحث نہیں کرتا جس کے متعلق مجھے یہ نہ معلوم ہو کہ وہ شخص بحث نہیں کرتا بلکہ عمل بھی کرتا ہے۔"

"لیکن ڈیلی ام کی لڑائی ہارنے کے بعد واپسی پر میں سقراط کے ساتھ تھا" اس نے کہا۔ "اگر ہر شخص کا رویہ سقراط جیسا ہوتا تو ہم کو فتح حاصل ہو جاتی۔ ایسے آدمی سے تو میں ہر وقت سوال و جواب کے لئے تیار ہوں۔"

لہذا لاکیز سے پہلا سوال کیا گیا۔ سقراط نے کہا۔ "نیکی پر بحیثیت مجموعی گفتگو کرنا تو بہت بڑی بات ہوگی۔ ہم اس کے ایک ایسے حصے سے بحث کریں گے جو فوجی تربیت کے لئے کافی ہوگا۔ لاکیز بتاؤ دلاوری کیا چیز ہے؟" لاکیز خوش ہو گیا۔ "دلاوری" کے متعلق اسے پوری طرح معلومات تھیں۔

"سقراط! اس کا جواب بہت آسان ہے۔ دلاور وہ ہے جو اپنی جگہ پر ڈٹا رہے اور بھاگے نہیں۔"

سقراط نے کہا۔ "اچھا جہاں تک پیدل کا تعلق ہے دلاوری کی یہ

تعریف بہت ہی مناسب ہے لیکن گھڑسوار دستوں کے متعلق کیا خیال ہے؟ کیونکہ وہ تو ہر وقت دوڑتے بھاگتے رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے سیتھیا والوں کا تو یہ بہت ہی مرغوب داؤں ہے کہ بھاگتے جاتے ہیں اور پیچھے مڑ کر تیر چلاتے جاتے ہیں۔ پھر بھی جب سمندر میں طوفان آیا ہوا ہو یا کوئی بیمار ہو یا کوئی غریب ہو یا سیاسی کارکن ہو تو ان سب قضیوں میں دلاوری کسے کہیں گے؟ کچھ لوگ تکلیف کو بڑی بڑی بہادری سے برداشت کرتے ہیں لیکن مسرت و آرام کا لالچ دیا جائے تو بازی ہار جاتے ہیں۔ تو لاکیز دلاوری کی عمومی تعریف کیا ہوئی؟۔"

لاکیز نے دوبارہ کوشش کی۔

"میرے خیال میں ہمت روح کی قوت برداشت کی ایک قسم ہے"

سقراط کا خیال تھا کہ اس تعریف میں اور بھی بہت سی باتیں شامل ہو گئی ہیں۔ دلاوری تو ایک وصف کا نام ہے لیکن بے معنی مشقت گذاری کو تو دلاوری نہیں کہہ سکتے۔

لاکیز نے اس بات پر غور نہیں کیا تھا۔

"میرا مقصد اس برداشت سے تھا جس میں فرزانگی شامل ہو"۔ اس نے کہا۔

"لیکن دانشور مشقت گذاری سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" سقراط نے پوچھا اور چند مثالیں دیں۔ "اس آدمی کے بارے میں کیا کہو گے جو جنگ میں مشقت برداشت کرتا ہے اور لڑنے کے لئے تیار ہے اور عقلمندی سے ہر کام

کا اندازہ کرتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ دوسرے اس کی مدد کریں گے اور یہ جانتے ہوئے کہ وہ اپنے سے کم تعداد اور کمزور آدمیوں سے جنگ کر رہا ہے اور یہ جانتے ہوئے کہ اس کا مورچہ مضبوط جگہ پر لگا ہوا ہے کیا تم یہ کہو گے کہ وہ آدمی جو اس فرزانگی اور تیاری کے ساتھ مشقت برداشت کرتا ہے، اس آدمی سے زیادہ دلاور ہے جس کے ارادے میں اتنی پختگی ہے کہ وہ دوسری طرف مخالف فوج میں اپنی جگہ ڈٹا کھڑا ہے۔"

لاکیز کو اس بارہ میں کوئی شک نہیں تھا کہ جس آدمی نے خطرات کو ملحوظ نہیں رکھا وہ دوسرے سے زیادہ بہادر تھا۔

"اور اس طرح ایک آدمی جو کنویں میں غوطہ لگاتا ہے لیکن غوطہ لگانا نہیں جانتا۔ وہ اگرچہ تربیت یافتہ غوطہ مار کے مقابلے میں زیادہ بیوقوف ہے لیکن زیادہ بہادر بھی ہے۔" لاکیز نے اتفاق کیا اگرچہ اس طرح اپنے ہی قول کی تردید کر رہا تھا کہ دلاوری کے لئے دانشوری ضروری ہے لیکن اب اسے دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی۔ یہ بات صاف ظاہر ہو گئی تھی کہ دلاوری کا مفہوم اس مفہوم سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ جو اس کے ذہن میں تھا یا جس کا اسے شعور حاصل تھا۔

"مجھے اب بھی یقین ہے کہ میں جانتا ہوں کہ دلاوری کیا چیز ہے۔ صرف یہ ہوا ہے کہ دلاوری کا تصور جیسے میرے خیال کی گرفت سے نکل رہا ہے اور میں اب اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔" اس نے اپنی بات پر ضد کرتے ہوئے کہا۔ اب نیسی اس نے مباحثہ میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ لاکیز خوش تھا

کریں اس کی بھی وہی گت بنے گی اور سقراط یہ ظاہر کر رہا تھا کہ جیسے اسے کچھ معلوم ہی نہیں۔ اس نے مباحثہ ختم کرتے ہوئے کہا۔ بہتر ہو کہ ہم لوگ اپنے لیے کوئی ایک معلم تلاش کر لیں۔ ہم لوگوں کو کچھ نہیں آتا۔ لہٰذا ہم اس قابل ہی نہیں کہ تعلیم کے سلسلے میں کچھ مشورہ دے سکیں۔

شاید ہم لوگ یہ خیال کریں کہ اس گفتگو سے تو کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور ظاہر بھی ایسا ہی معلوم ہوتا تھا لیکن سقراط کو اس بات کا شعور حاصل ہو گیا کہ بحث کے دوران میں کچھ افکار و تصورات ضرور نمودار ہوتے ہیں ان پر غور کرنا ضروری ہے۔

حقیقت میں لاکیز نے بہت کچھ سیکھا۔ اس کے لئے یہ بالکل نیا خیال تھا کہ دلاوری جنگ کے علاوہ ہر شے سے متعلق ہے اور یہ خیال اور بھی نیا تھا کہ دلاوری کا دانش سے بھی تعلق ہے۔ دراصل یہ خیال کہ عمل کی طرح علم بھی حقیقی دلاوری کے حصول کے لئے بہت ضروری ہے اس قدر عجیب و غریب تھا کہ لاکیز پریشان ہو گیا۔ غار کے اس قیدی کی طرح جس کی آنکھیں روشنی کو دیکھ کر خیرہ ہو گئی تھیں۔ لیکن اپنی اس الجھن کے باوجود صحیح خطوط پر سوچ رہا تھا۔

اگر لاکیز سقراط سے باتیں کرتا رہتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ اس کی پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ اس نے محض عادتاً دلاوری کو ایک مختصر دائرہ میں محدود کر رکھا تھا۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ میدان جنگ میں ایک آدمی کا صحیح طرز عمل کیا ہونا چاہیے لیکن اسے وہ اصل اصول معلوم نہ تھا جسے ملحوظ رکھ کر انسان ہر حالت میں

ٹھیک طرز عمل اختیار کر سکتا ہے۔ سوال یہ تھا کہ لاکیز نے جو میدان جنگ میں
اڑے رہنے کو دلاوری کہا تھا تو کیا اس قسم کی دلاوری سے زندگی کے دوسرے
امتحانوں میں ثابت قدم رہنے میں مدد مل سکتی تھی۔ مثلاً مان بھی لیا جائے کہ لاکیز
نے لڑائی میں جو تربیت پائی تھی تو اسے دلاوری حاصل ہو گئی تھی۔ پھر کیا اس
دلاوری کی مدد سے کام لے کر وہ جھوٹ بولنے سے اپنے آپ کو بچا سکتا تھا۔
بالفاظ دیگر آزمائش اور امتحان کے موقعوں پر وہ سچ بولے گا اور ڈٹا رہے گا یا
جھوٹ بول کر اپنی گلو خلاصی کرا لے گا۔

لاکیز نے جب کہا کہ دلاوری ہمیشہ اچھی ہوتی ہے تو معلوم ہوا کہ
دلاوری کے متعلق اس کے افکار و تصورات ایک اور رخ سے بھی محدود اور
ناقص ہیں۔ کیونکہ اس کے خیال میں غیر تربیت یافتہ غوطہ زن نے جب کنوئیں
میں چھلانگ لگائی تو دلاوری کا کام کیا۔ اس نے مقصد کی اہمیت کا خیال ہی
نہیں کیا تھا۔ وہ صرف عمل کے متعلق سوچا کرتا تھا۔ آگے بڑھتے رہنا اور پیچھے
نہ ہٹنا یہی دلاوری اور یہی اچھائی تھی بذات خود۔ لیکن جہاں تک کنوئیں میں
چھلانگ لگانے کا سوال ہے یہ کام خوفزدہ جانور بھی کر سکتا ہے اور ایک بہادر انسان
بھی جو کسی ڈوبتے ہوئے بچے کی مدد کرنا چاہتا ہو۔ کودنے کا مقصد ہی اس
فعل کو اچھا یا برا بنا سکتا ہے۔ سقراط سے اس کی باتیں جاری رہتیں تو سقراط
کہتا کہ محض آگے بڑھنا ہی دلاوری نہیں ہے بلکہ اچھائی کی منزل کی طرف
آگے بڑھنا دلاوری ہے۔ سقراط کی تحقیق کا اصل مقصد اس مباحثے کے ذریعہ
عیاں ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ لاکیز تھک گیا ہے تو اس نے

مسئلہ کو وہیں رہنے دیا۔ وہ لاکیز سے کہہ سکتا تھا کہ دلاوری علم کا نام ہے یعنی اس بات کا علم کہ اچھا کیا ہے اور برا کیا ہے اور ساتھ ہر حال میں یہ فیصلہ کرنے کی ہمت کہ میں برا کام نہیں کروں گا لیکن یہ بات لاکیز کو بتا بھی دی جاتی تو اس وقت اسے کیا فائدہ ہوتا۔ کسی دن وہ خود ہی اس گتھی کو حل کر کے ایک نتیجہ پر پہنچ جائے گا۔ لاکیز ان ماہرین میں سے ایک تھا جن سے سقراط نے ان کی معلومات خصوصی کے متعلق سوالات کیے۔ سقراط کے سامنے اگر نیکی کی کسی نئی قسم کا ذکر کیا جاتا تو وہ ایسا خوش ہوتا جیسے مکھی شہد پا کر خوش ہوتی ہے۔

ایک دن فوج سے واپسی پر وہ ایک کشتی کے اکھاڑے میں پہنچ گیا جنگ کی خبریں معلوم کرنے کے لئے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اتنے میں کارمیدیز جو اس وقت شہر میں سب سے زیادہ خوبصورت اور ہردلعزیز جوان تھا اور جس کے متعلق لوگ کہتے تھے کہ اس کی سیرت بھی اتنی ہی حسین ہے جتنی صورت، سقراط کے پاس آ گیا۔ اس کے سر میں درد ہو رہا تھا اور اس نے لوگوں سے سنا تھا کہ سقراط سر کے درد کی دوا جانتا ہے۔ لیکن قبل اس کے وہ اندازہ کر سکے سقراط نے اسے ضبط نفس اور انکسار کے مباحثہ میں الجھا دیا۔

نوجوان تھی ایٹی ٹس جس کے قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی دن وہ اچانک بہت بڑا ریاضی داں ہو گا۔ سقراط کو علم کا مفہوم متعین کرنے میں مدد دے رہا تھا۔ سقراط نے اس سے سوال کیا "کیا جاننا یا علم دیکھنے اور محسوس کرنے ہی کو کہتے ہیں؟"

اپنے مدرسہ کے زمانے کے دوستوں لائی سس اور مے نگزے نس سے اس نے سوال کیا تھا۔ ''دوستی کیا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ چاہنا یا چاہا جانا؟''

مذہبیات کا ماہر یوتھی فرو بازار سے گزر رہا تھا۔ صورت یہ تھی کہ اس کے بوڑھے باپ نے دیوتاؤں کی توہین کی تھی۔ اس پر مقدمہ قائم کیا گیا اور اب بیٹا باپ کے خلاف مقدمہ کی پیروی کرنے کے لئے جا رہا تھا۔ راستہ میں اس کی سقراط سے ملاقات ہوئی اور تقویٰ پر بحث ہونے لگی۔ سقراط نے اس سے سوال کیا۔ تمہارے اعمال اس لئے درست ہیں کہ دیوتاؤں کے احکام کے مطابق ہیں۔ یا ایسا ہے کہ دیوتاؤں نے ان اعمال کے بجالانے کا حکم صرف اس لئے دیا ہے کہ وہ اعمال بذات خود اچھے ہیں؟''

سقراط کے آخری ایام میں ایتھنز میں اور لوگ بھی تھے جو سوالات کرتے تھے کچھ لوگ تو ایسے تھے جنہوں نے سقراط کو سوالات کرتے ہوئے سنا تھا اور اس کا طریقہ سیکھ لیا تھا۔ وہ سوال کرنے کا طریقہ تو جانتے تھے لیکن اس کے مقصد اور روح سے ناآشنا تھے۔ یہ نقالی مذاق اور دلچسپی کے لئے تو بہرحال اچھی تھی۔ اگر انسان لفظی ہیر پھیر کو نامناسب نہ سمجھے تو سوالات کے ذریعہ ہر بات ثابت کرسکتا ہے۔ مثال کے طور پر سوفسطائی ڈائیونائی سدورس ایتھنز کے ایک نوجوان سے ورزش گاہ میں کہہ رہا تھا کیا میں ثابت کردوں کہ تمہارا باپ ایک کتا تھا۔ (سقراط یہ بات سن کر خوب ہنسا۔ یہ سوفسطائی دعوے کرتا تھا کہ وہ دنیا کے ہر شخص کے مقابلے میں نیکی کا درس زیادہ تیزی اور

مدگی سے دے سکتا ہے)''تم کہتے ہو کہ تمہارے پاس ایک کتا ہے''؟

سوفسطائی نے پوچھا۔

''ہاں ایک خوفناک کتا۔''

''کیا اس کے بچے ہیں؟''

''ہاں بالکل اس جیسے۔''

''اور کتا ان کا باپ ہے؟''

''ہاں مجھے اس کا یقین ہے۔''

''اور کیا وہ تمہارا نہیں ہے؟''

''یقیناً ہے۔''

سوفسطائی نے فتحمندانہ نظروں سے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔ ''پس ثابت ہوا کہ کتا ایک باپ ہے اور وہ تمہارا ہے اور اس لئے وہ تمہارا باپ ہے اور پلے تمہارے بھائی ہیں۔''

اگر سقراط چاہتا تو وہ بھی ایسے ہی تماشے دیکھا سکتا تھا مثلاً اس کے نوجوان دوست جب شام کو گھر میں کھانا کھاتے تھے۔ تو رعب جمانے کے لئے اپنے گھروں میں ایسی ہی شعبدہ بازی کیا کرتے تھے۔ یا وہ سوفسطائیوں کی طرح اس سے بھی زیادہ خطرناک کھیل کھیل سکتا تھا۔ اگر وہ اپنے شاگردوں سے کہتا کہ دنیا میں حقیقت ہے ہی نہیں جس کی تلاش کی جائے۔ سوال جواب سے سقراط کا مقصد بالکل مختلف تھا۔ اسے زندگی کے لئے ایک ٹھوس بنیاد کی تلاش تھی۔ یہ کام وہ اپنے دوستوں کے لئے کر رہا تھا۔

سقراط دوستی کو بہت اہمیت دیتا تھا۔ وہ اپنے شاگردوں کو شاگرد نہیں بلکہ دوست سمجھتا تھا۔ زن ٹیپی نے اگرچہ اسے بہت مجبور کیا کہ وہ لوگوں سے تعلیم دینے کا معاوضہ لے لیکن اس نے کسی طرح یہ بات گوارا نہ کی۔ سقراط کا خیال تھا کہ جو کچھ وہ لوگوں سے اپنے علم کے لئے پوچھتا تھا اسے وہ سکھانا یا تعلیم دینا کیسے کہہ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ وہ کچھ لیتا نہیں تھا۔ اس لئے ہر شخص اس کے پاس آ سکتا تھا۔ وہ ان سب کے آنے کا خواہش مند تھا اور کسی کے لئے اپنا دروازہ بند نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ بوڑھے جوان اسکول کے بچے شہری اور پردیسی یہاں تک کہ عورتوں اور غلاموں کو بھی نیکی کا راستہ دکھانے کو تیار رہتا تھا۔ ایتھنز میں جو شخص بھی چاہتا سقراط کا دوست ہو سکتا تھا۔ یہ بدقسمتی تھی کہ یہ لوگ خصوصیت سے بوڑھے جو اب اپنے راستوں کو بدلنا نہیں چاہتے تھے اس کے کام کا مطلب غلط سمجھتے تھے۔

سقراط کے دوست عام طور سے نوجوان تھے۔ وہ سقراط سے اس لئے محبت کرتے تھے کہ وہ بھی زندگی سے اتنی ہی دلچسپی رکھتا تھا جتنی انہیں تھی اور اتنا ہی سراغ جو بھی تھا۔ انہوں نے اس کے باطنی حسن کو دیکھ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر وقت اس کے ساتھ رہتے تھے۔ سقراط نے بھی ان میں ایک حسن اور ایک طاقت دیکھی تھی اور شاید انہیں اس بات کا احساس تھا۔ اس نے اندازہ کیا تھا کہ جس طرح وہ ورزش گاہ میں دوڑ سکتے تھے اور کشتی لڑ سکتے تھے اسی طرح ایک خیال کے پیچھے بھی دوڑ سکتے تھے اور تردید کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ جب کوئی مباحثہ انہیں منزل مقصود کی طرف بڑھتا ہوا نظر آتا تو وہ یہ نہیں کرتے تھے کہ

ازراہ احتیاط اپنے قدم روک لیں بلکہ وہ بے باکانہ آگے بڑھ جاتے تھے وہ نیکی
کو دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو جاتے۔

سقراط کو یقین تھا کہ جب لوگ ایک دوسرے کے حسن باطن کو دیکھ کر
ایک دوسرے کی نیکیوں پر فریفتہ ہوتے ہیں تو حقیقی دوستی وجود میں آتی ہے۔
ایسی دوستی بہت ہی بیش قیمت ہے جو لوگ اس نیکی کی بنا پر ایک دوسرے کے
دوست ہوتے ہیں اور اس بنا پر نہیں کہ انہیں ایک دوسرے کی صورت پسند ہے۔
وہ ایک ایسے رشتہ میں منسلک ہو جاتے ہیں جس سے دونوں میں نیک افکار اور
تصورات کی نشوونما ہوتی ہے۔ ایک دوست اپنے دوسرے دوست کی نیکی اور
حسن سے محبت کرتا ہے گویا وہ اس کی اپنی ہی نیکی اور اس کا اپنا ہی حسن ہو اور
جس چیز سے دوسرے دوست کو پیار ہوتا ہے اسی چیز کی پرورش اپنے باطن میں
کرتا ہے۔ حسین تصورات اور خصوصیات اسی دوستی سے پیدا ہوتی ہیں۔ جو
دوست ایک دوسرے میں نیکیوں کو دیکھ کر اپنی دوستی کا آغاز کرتے ہیں انہیں نیکی
جہاں بھی نظر آتی ہے وہ اسے پسند کرتے ہیں۔

سقراط نے ایک بار کہا کہ لوگوں کو اچھے گھوڑے، کتے اور پالی کے
سامنے دیکھ کر مسرت حاصل ہوتی ہے لیکن مجھے اچھے دوستوں سے مل کر زیادہ
مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اگر مجھے کوئی اچھی چیز معلوم ہے تو میں اپنے دوستوں
کو بتا دیتا ہوں۔ جن سے میں سمجھتا ہوں کہ وہ کچھ نیکیاں حاصل کر سکیں گے۔
ظاہر ہے کہ نیکی کی جستجو کے لئے سقراط کے نزدیک اس کے دوستوں کے حلقے
سے بہتر کوئی دوسرا صحیح اور فطری مقام نہیں ہو سکتا تھا حقیقت یہ ہے کہ اس کی جستجو

طراز بلکہ فی الحقیقت ایک دوست تھا۔ جب دوست کلام کرتا ہے تو الفاظ و اسلوب ہی بالکل مختلف ہوتا ہے۔ جس طرح ایک آگ سے دوسری آگ روشن ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ گفتہ و ناگفتہ الفاظ کے معانی اور ان کی روح شعلے کی طرح ایک دوست سے دوسرے دوست تک منتقل ہوتی ہے۔ سقراط کے دوستوں کو اس کی باتیں بھی اس کی دوستی ہی کی طرح عزیز تھیں۔ اور جب افلاطون نے اپنی یاد کے مطابق اپنے استاد کے مکالمے قلم بند کیے تو پس منظر میں ورزش گاہ، بازار، دعوت اور سیر و تفریح کی فضا قائم رہی کہ یہی دوستانہ فضا مکالمات کی جان تھی۔

ایلسی بیادیز

افلاطون کے علاوہ، جو ذرا بعد میں سقراط کے قریب آیا۔ سقراط کے
[illegible]یم دوستوں میں ایتھنز کے لوگوں کا منظور نظر نوجوان اور فارقلیس کا شاگرد
[illegible]سی بیادیز سب سے زیادہ مشہور تھا۔ اس بات کا پتہ کہیں سے نہیں چلتا کہ ان
[illegible]نوں کی ملاقات کس طرح ہوئی۔ یا ان دونوں میں پہلی ملاقات پر کیا باتیں
[illegible]ہوئیں۔ لیکن ان دونوں کے متعلق ہمیں جو کچھ معلوم ہے اس سے البتہ قیاس کیا
جا سکتا ہے۔

اس داستان کی کڑیوں کو صحیح طریقے پر جوڑنے کے لئے ہمیں چند
سال پیچھے لوٹنا پڑے گا۔ جب سقراط کی عمر بیس اور تیس کے درمیان تھی اور وہ
شاید ابھی تک سنگ تراشی کرتا تھا۔ اگرچہ اس کا دماغ حقیقت کی جستجو کی طرف
مائل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ایتھینا کے مندر پارتھینان کی تعمیر میں دس برس صرف
ہو چکے تھے۔ اس شاندار جلوس کے نقش و نگار تھوڑے دن ہوئے مندر کی دیوار پر
ثبت کئے گئے تھے۔ جس میں بجز کٹتے ہوئے گھوڑے، اور صدر نشین دیوتا، بہت
خوش نما دکھائی دیتے تھے۔ سونے اور ہاتھی دانت سے بنا ہوا دیوی کا مجسمہ اندر
نصب ہو چکا تھا۔ صرف مجسموں کا کام باقی تھا اور یہاں کی نازک سنگ تراشی

صرف شہر کے ماہر فن کار ہی کر سکتے تھے۔ سقراط کی قسم کے سنگ تراش پہاڑی کے مغربی کنارے الیکرو پولس کے شاندار پھاٹک (پروپلیا) کا کام کرنے کے لئے بھیج دیئے گئے تھے۔

موگری اور تیشہ سے اب سقراط کام لینا خوب جانتا تھا۔ کام کرتے وقت اسے نئی عمارت کے گردو پیش کی چہل پہل صاف دکھائی دیتی تھی۔ کہیں غلاموں کے گروہ سنگ مرمر کی سلیں اٹھائے لا رہے ہیں۔ کہیں بڑھئی مچان کھڑے کر رہے ہیں اور کہیں سنگ تراش بنیادوں اور تختوں کو ٹھیک ٹھاک کر رہے ہیں۔ انہیں دنوں اس نے ایک لڑکے کو ڈھال پر چڑھتے دیکھا۔ لڑکا کاریگروں کے ہجوم میں اپنا راستہ کاٹتا بڑھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے کافی فاصلہ پر ایک غلام تھا لیکن لڑکے کو گویا اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس کا سبب سقراط کو بعد میں معلوم ہوا۔ لڑکے کا چہرہ دلکش تھا اور وہ اس طرح چل رہا تھا جیسے اسے احساس ہو کہ لوگ اسے دیکھ رہے ہوں گے۔ وہ سقراط کے قریب آیا اور بغیر کسی جھجک کے اس کی طرف بغور دیکھنے لگا۔

''کہیئے جی۔'' لڑکے نے کہا۔

''ہاں میاں'' سقراط نے نرمی سے جواب دیا اور اپنے کام میں مشغول رہا لڑکے نے دوبارہ اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی۔

''تمہیں معلوم بھی ہے میں کون ہوں۔ میں الیسی بیادیز ہوں۔''

اس کے شیریں تبسم نے گویا اس کے چہرے کے خدوخال کو منور کر دیا تھا۔ سقراط نے گردن ہلائی اور دوسرا تیشہ اٹھالیا۔

''تم سقراط ہو نا؟ دانش ور؟'' لڑکے نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ گزشتہ رات فارقلیس تمہارے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ اگرچہ کھانے کے وقت مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے مگر میں آ ہی نکلا ہوں۔ اگر میں آنا چاہوں تو وہ مجھے روک نہیں سکتے۔'' دفعتاً وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔ اس نے ایک پتھر اٹھا لیا۔ سقراط نے کسی کے چیخنے کی آواز سنی۔ گردن اٹھا کر دیکھا تو اسے سنگ مرمر کی ایک سل کے پیچھے ایک بوڑھے کا سر غائب ہوتا ہوا نظر آیا۔ پتھر اس کے کان کے قریب لگا تھا۔

الیسی بیاڈیز نے خوش طبعی کے انداز میں کہا۔

''یہ میرا غلام زوپی رس ہے۔ فارقلیس نے اسے میرا اتالیق مقرر کیا ہے اور ہر وقت میرے ساتھ رہنے کو کہا ہے۔ میں کسی غلام کی نگرانی میں رہنا پسند نہیں کرتا۔''

''تم کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ غلام ہے؟'' سقراط نے تعجب سے پوچھا۔

الیسی بیاڈیز نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اس لئے کہ فارقلیس نے کہا یہ لو غلام اپنا۔'' وہ میرے یا فارقلیس کے حکم پر عمل کرتا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔''

''تم کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ تم بھی غلام نہیں ہو۔'' سقراط نے پہلی بار الیسی بیاڈیز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ زوپی رس چھپا ہوا تھا پھر بھی یہ بات سن کر اس نے وہیں جھک کر اپنی سانس روک لی۔ لیکن معلوم نہیں الیسی

یاد یز کو کیوں غصہ نہیں آیا۔ اس نے گھور کر سقراط کی طرف دیکھا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ میں کلی آسٹھیس اور ڈی آینو سینکے کا بیٹا ہوں۔''

اس نے آہستگی سے کہا۔ ''میرے باپ کے چچا کو ایرانیوں کے خلاف بڑی جنگ میں بہادری کا تمغہ ملا تھا۔ میرا باپ کا کرونیا پر چڑھائی کرنے والی فوجوں کی کمان کرتے ہوئے مارا گیا تھا۔ میری ماں فارقلیس کی بہن تھی اور میں فارقلیس کے گھر ہی رہتا ہوں۔ میں غلام کیسے ہو سکتا ہوں۔ لیکن تمہارا شاید یہ مطلب ہی نہیں تھا۔''

''نہیں'' سقراط نے جواب دیا۔ ''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' ایلسی بیاد یز ایک لمحہ کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔ تمہارا مطلب ہے کہ جو لوگ اپنی مرضی سے کام نہیں کر سکتے وہ غلام ہوتے ہیں اور تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ اس طرح میں بھی غلام ہوں کہ نہیں۔''

سقراط نے اشارے سے کہا ''ہاں''۔

ایلسی بیاد یز ہنسا اس نے کہا۔ ''اس کا جواب آسان ہے۔ تم نے مجھے زوپی رس کو مارتے دیکھا ہے جب میرا جی مارنے کو چاہتا ہے میں اسے مارتا ہوں۔ یوں بھی میرا جو جی چاہے وہی کرتا ہوں۔ اپنی مرضی کے خلاف میں کوئی بات کرتا ہی نہیں۔''

''سوچنے کی بات ہے۔'' سقراط نے کہا۔

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں'' ایلسی بیاد یز بولا۔ زوپی رس سے پوچھ لو۔ بعض اوقات تو میں سوچتا ہوں کہ میں ایتھنز میں سب سے زیادہ آزاد آدمی

ہوں۔ یہاں تک کہ فارقلیس کو بھی ایوان کے احکامات پر عمل کرنا پڑتا ہے لیکن
میں تو جو چاہتا ہوں سو کرتا ہوں۔ میں اپنے بھائی کلی آئینئیس کو بھی یہی سکھا رہا
تھا کہ بھائی وہی کام کرو جو کرنا چاہو۔ لیکن ان لوگوں نے اسے کہیں اور بھیج دیا۔
فارقلیس کہتا تھا کہ میں بھائی پر برا اثر ڈال رہا ہوں۔ لیکن میرا یہ خیال نہیں
ہے۔ میں تو اسے رہنے کا طریقہ سکھا رہا تھا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے سکول
میں پانسری کے درس کے خلاف ہڑتال کروا دی۔ شاید تم نے کسی سے اس
بارے میں سنا بھی ہو۔ آخر کار استادوں کو مجبور ہو کر ہار ماننا پڑی۔ ہاں ہاں میں
اپنی مرضی کا مالک ہوں۔"

سقراط پر اس کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اپنے کام میں مصروف
ہو گیا اور بولا۔ "ایلسی بیاویز میں سوچ رہا ہوں کہ کیا واقعی تم وہی کام کرتے ہو
جو تم کرنا چاہتے ہو۔ مثال کے طور پر پتھر پھینکنے والے قصہ پر غور کرو۔ فرض کرو
کہ میں فارقلیس کے پاس جاؤں اور کہوں کہ فارقلیس تم نے اور ایلسی بیاویز
نے طے کیا تھا کہ ایلسی بیاویز فوج کے گھڑ سوار دستوں میں شامل ہو گا لیکن
دراصل ایلسی بیاویز کی یہ مرضی نہیں بلکہ وہ تو بدیسی امدادی فوج میں نام لکھانا
چاہتا ہے۔ فلاخن چلانا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ اکثر پتھر پھینکتا رہتا ہے اگر میں یہ
کہوں تو کیا تم مجھ سے اتفاق کرو گے؟"

"بالکل نہیں" ایلسی بیاویز نے جواب دیا۔

"میں پتھر نہیں پھینکنا چاہتا۔ زوپی رس کو پتھر مارنے سے میرا مقصد
بالکل دوسرا ہے۔ میں زوپی رس کو یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ میں اس سے بہتر

افضل ہے۔"

"میں سمجھا" سقراط بولا۔ "لیکن کس بات میں بہتر۔"

ایلسی بیاڈیز اس کے سوال کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ سقراط نے کہا۔

"میں تم کو چند مثالیں دیتا ہوں۔ کیا ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ جوتے بنانے والا اس جوتے بنانے والے سے بہتر ہے۔"

"ہاں۔"

"اور وہ کس بات میں بہتر ہے۔"

"یقیناً جوتے بنانے میں۔"

"اور ایک جہاز ران دوسرے جہاز ران سے جہاز چلانے میں بہتر ہے اور ایک نانبائی دوسرے نانبائی سے روٹی پکانے میں بہتر ہے۔"

"یقیناً" ایلسی بیاڈیز بولا۔ "لیکن اس بات کا مجھ سے کیا تعلق۔ میں نانبائی نہیں ہوں۔"

سقراط بولتا رہا۔ "اور ایک پتھر پھینکنے والا دوسرے پتھر پھینکنے والے سے پتھر پھینکنے میں بہتر ہے۔ اور یقیناً تمہارے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ تمہارا اور زوپی رس کا پتھر پھینکنے میں مقابلہ ہو رہا ہے۔ اور تم ثابت کرنا چاہتے ہو کہ اس سے اچھے پتھر پھینکتے ہو۔"

ایلسی بیاڈیز نے زمین پر پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔ سقراط! تم خوب سمجھتے ہو کہ بہتر سے میرا کیا مطلب ہے۔ میں نانبائی، موچی، تاجر یا سنگ انداز کی حیثیت سے بہتر نہیں ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ بحیثیت انسان بہتر ہوں۔"

سقراط کا بدصورت چہرہ یوں دمک اٹھا۔ جیسے کوئی خزانہ اچانک اس کے ہاتھ آ گیا ہو۔ اس نے کہا۔ ''کلی آئینیس کے بیٹے ایلسی بیادیز! ہم دونوں کو دوست بن جانا چاہیے۔ نیکی جس کے ذریعہ ایک آدمی بحیثیت انسان بہتر ہو جاتا ہے۔ اس کی ہم دونوں کو ضرورت ہے اور اگر تم مجھ سے متفق ہو اور اس بات پر راضی ہو تو ہم دونوں نیکی یا اچھائی کی جستجو اس وقت تک جاری رکھیں گے۔ جب تک ہم کامیاب نہ ہو جائیں۔ لیکن مجھے اس بات میں شک ہے کہ سنگ اندازی کر کے ہم نیکی کی جستجو میں کامیاب ہو جائیں گے۔'' ابھی اس نے اپنی بات ختم بھی نہ کی تھی کہ اس نے پھر اپنا کام شروع کر دیا لیکن نظر آتا تھا کہ اس کے گوشہ چشم میں ایک لرزش سی ہے۔ گویا مسکرا رہا ہے اور مسکراہٹ کو چھپانے کی کوشش بھی کر رہا ہے۔

اس کے بعد جب لوگ ایلسی بیادیز کو سقراط کے آگے پیچھے دیکھتے۔ کبھی ورزش گاہ میں اسے اس کے پیچھے چلتا ہوا دیکھتے اور کبھی اسے کھانے پر مدعو کرتے دیکھتے تو ہنستے اور کہتے کہ ایلسی بیادیز اپنے آپ کو توجہ کا مرکز بنانے کا ایک نیا طریقہ سیکھ رہا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ سوال جواب کا کھیل اسے بہت دنوں تک منہمک نہ رکھ سکے گا۔ لیکن وہ غلطی پر تھے۔

ایلسی بیادیز کو پہلے اشتیاق سقراط کے پاس لایا اور واپس گیا تو یہ خیال لے کر گیا کہ سقراط کی نقل اتاروں گا۔ وہ سقراط کی مینڈک کی طرح ابھری ہوئی آنکھوں کی ترچھی نظروں سے نقل اتارتا تھا۔ وہ سقراط کی چال کی نقل اتارتا تھا۔ جو حواصل کی طرح تھی اور اس کی ناتمامیوں، جہاز رانوں اور موچیوں کے متعلق

باتوں کا مذاق اڑاتا تھا۔ یہ باتیں سن کر اس کے دوست ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے اور کہتے تھے کہ ایلسی بیادیز نے آج تو کمال ہی کر دیا ہے۔ مار ڈالا ہے ہنسا ہنسا کے۔ لیکن اس پہلی ملاقات کے نتیجے کے طور پر ایلسی بیادیز میں ایک اور بات رونما ہونے لگی تھی۔ جس کا اس وقت اسے مشکل سے احساس ہوا ہوگا اور جس کی اسے ہرگز توقع نہ تھی۔

بچپن ہی سے ایلسی بیادیز کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر معاملے میں دخیل نظر آتا تھا۔ جب اس کا باپ مر گیا اور اسے اپنے گھر کے بغیر ہی گزارا کرنا پڑا تو یہ صورت ہو گئی کہ جو کچھ اہم بات ہوئی۔ یا تو اس کا آغاز اس نے کیا یا پھر اس نے دوسرے لوگوں کو ادھر ادھر ہٹا کے اپنا مقام حاصل کر لیا اور ہر معاملے میں سب سے نمایاں شخصیت اسی کی نظر آنے لگی۔ وہ مالدار تھا، خوبصورت تھا اور ہر دلعزیز تھا۔ وہ خیال رکھتا تھا کہ ایسی صورت پیدا ہوتی رہے کہ شہر میں عام طور سے لوگ اس کے متعلق باتیں کرتے رہیں۔ سقراط سے ملنے سے قبل اس کا خیال تھا کہ وہ ہر ایسی بات جانتا تھا جو اس قابل تھی کہ جانی جائے اور ہر ایسا کام کرتا تھا جو واقعی کرنا چاہیے تھا۔

سقراط کا ایک راز تھا۔ ایلسی بیادیز پہلے ہی دن یہ بات بھانپ گیا اور اسے معلوم کرنے پر تل گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سقراط کسی دوسرے شہر میں رہتا ہے جہاں ان تمام چیزوں کی جو ایلسی بیادیز کے پاس تھیں اور جن پر اس کو ناز تھا۔ کوئی وقعت نہ تھی۔ سقراط ایتھنز کی سڑکوں پر پھرتا رہتا تھا وہ ایتھنز کے دوسرے باشندوں کی طرح بھرپور زندگی بسر کر رہا تھا۔ لوگوں سے مذاق کرتا ان

ریکھا بار اس کے نام پوچھتا اور تمام ضروری خبریں سننے کے لئے بے چین
تھا۔ اس کے باوجود وہ دراصل بے تکلفانہ اپنے دوسرے شہر میں زندگی بسر کرتا
تھا۔

جس وقت ایلسی بیاڈیز سقراط سے باتیں کرتا اسے دوسرے لوگوں
کے مقابلہ میں زیادہ صاف طور پر اس دوسرے شہر کی دلفریب اور حیرت انگیز
زندگی کی جھلک دکھائی دیتی جہاں سقراط رہتا تھا۔ سقراط کے شہر میں انسان آزاد
تھا ان حسوں میں آزاد تھا جن کا ایلسی بیاڈیز کو اس سے پہلے شعور تک نہیں
حاصل ہو سکا تھا۔ اسے ایک صاف اور واضح سمت میں عمل پیرا ہونے کی پوری
آزادی تھی۔ اس شہر میں وہ سیکڑوں تحریصیں، اندیشے اور عداوتیں نہیں تھیں جو
چابک دست آقاؤں کی طرح انسان کو ادھر سے ادھر لئے پھرتی تھیں۔ سقراط کے شہر
کے معیار حیات کے مطابق ایلسی بیاڈیز نے اپنے آپ کو ایک غلام پایا۔

سقراط کے شہر میں ہر چیز اوندھی تھی۔ یا شاید سقراط کے شہر میں ہر چیز
اپنی صحیح حالت پر ہو اور دوسرے لوگوں کے شہروں میں ہر چیز الٹی ہو۔ ایلسی
بیاڈیز ایتھنز کے شہر میں تحسین و آفرین کا جو ارغوانی لبادہ اوڑھے بڑے فخر سے
گھومتا پھرتا تھا۔ سقراط کے شہر کی تیز ہواؤں میں اس کی دھجیاں اڑ گئیں۔ یہاں تک
کہ وہاں اس کا گٹھا ہوا نوجوانی والا خوبصورت جسم بھی نظر نہیں آتا تھا جب سقراط نے
اس کی طرف دیکھا تو اس کی ناتواں و بے لباس روح گویا سردی سے کانپتی
دکھائی دی۔ سقراط کے شہر کے لوگ بالکل دوسری طرح کے کپڑے پہنتے تھے۔
جیسے راست بازی اور حق گوئی اور صداقت کے بنے ہوئے۔ وہ ایتھنز کے

لوگوں کی طرح نقلی راست بازی اور صداقت کا لباس نہیں پہنتے تھے۔ ان کا لباس تو ایسا تھا کہ اسے پہنے تو بھلا مانس محفل میں شرم سے پانی پانی ہو جائے۔ جو طاقت اور آزادی دوسرے آدمیوں کے شہر میں بدی کو حاصل تھی۔ سقراط کے شہر میں وہی چیز راست بازی اور حق کو حاصل تھی۔

ایسے کتنے ہی موقعے آئے جب ایلسی بیادیز کے دل میں سقراط کے شہر سے وابستہ ہو جانے کی تمنا پیدا ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ سقراط بڑی خوشی سے اسے اپنے شہر میں داخل ہونے کی اجازت دے دیگا۔ لیکن داخل ہونے سے پہلے کچھ قیمت ادا کرنا ضروری تھی۔ اس شہر کے انوکھے پن کی یہ ایک دوسری دلیل تھی۔ ایلسی بیادیز امیر تھا اور سقراط غریب۔ پھر بھی یوں معلوم ہوتا تھا گویا سقراط کے شہر میں داخلہ کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ ایلسی بیادیز کی بساط سے باہر ہے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ایلسی بیادیز کو یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس شہر میں رہنے کی قیمت کئی بار ادا کرنی پڑے گی۔ یہاں تک کہ سقراط کی طرح وہ بھی اس قیمت کو ہیچ تصور کرنے لگے۔

ایتھنز میں گنتی کے لوگ ہی جانتے ہوں گے کہ ایلسی بیادیز اور سقراط کے مابین معاملات کی کیا صورت تھی اور خود ایلسی بیادیز کے ذہن میں کیا کیا خیال آتے تھے۔ لوگ واقعات کو تو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ وہ ان دونوں کو اکثر ایک ساتھ دیکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی گہری دوستی زبان زد خلائق ہو گئی اور پھر آہستہ آہستہ ایک معمولی بات ہو گئی۔ ساتھ ہی انہوں نے دیکھا کہ ایلسی بیادیز اب نازوں کا پالا بچہ نہیں رہا بلکہ ایک من مانی کرنے والا اور خطرناک

نوجوان بن رہا ہے۔ پہلے وہ ایلسی بیادیز کی ذہانت کی تعریف کرتے تھے اور اسے شاباش دیتے تھے۔ بعد میں انہوں نے سقراط پر یہ الزام لگایا کہ اس نے ایلسی بیادیز کو گمراہ کر کے رکھ دیا ہے۔

ایلسی بیادیز اور سقراط کی دوستی بہت وحشت ناک اور اشتعال انگیز تھی اور اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ سقراط نے ایلسی بیادیز میں کیسا جوہر دیکھا تھا کہ وہ ہر دشمن سے انتظار کرنے کے لئے تیار تھا۔ یوں ہوتا تھا کہ ابھی تو ایلسی بیادیز ایک زنجیر میں بندھے ہوئے کتے کی طرح سقراط کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ لیکن فوراً بعد اس نے ایک مجنونانہ مہم کا بیڑا اٹھا لیا ہے کہ سارے ایتھنز میں تھو تھو ہو رہی ہیں۔ اس کے دماغ میں سقراط اور سقراط کا شہر گویا ہم معنی کلمات تھے۔ جب وہ ایک سے فرار اختیار کرتا تو گویا دوسرے سے بھی خود بخود دور ہو جاتا تھا۔

مثال کے طور پر شہر میں یہ قصہ مشہور تھا کہ ایک دن ایلسی بیادیز ہپونیکس کے پاس گیا۔ ہپونیکس ایک مخصوص قسم کا لکھ پتی بڈھا تھا۔ ایلسی بیادیز نے بعد میں اس کی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ ایلسی بیادیز نے بوڑھے کے منہ پر طمانچہ مارا۔ کیوں؟ "آپ ایلسی بیادیز کو جانتے ہی ہیں۔ شاید کوئی شرط لگی ہو گی یا پھر محض مذاق ہی مذاق میں ایسا کر دیا ہو گا۔" دوسرے دن صبح کو اور بھی زیادہ حیرت انگیز خبر سننے میں آئی۔ ایلسی بیادیز نے معافی مانگ لی تھی۔

ہپونیکس نے اسے حقیقت میں معاف کر دیا۔ لوگ ہمیشہ اپنے جذبات کو ملحوظ رکھ کر ایلسی بیادیز کو معاف کر دیا کرتے تھے۔ لیکن ذہنی طور پر کئی

طور پر، وہ اس کی طرف سے بدگمان رہتے تھے۔ جب ایلسی بیاڈیز اپنے ایک دوست انیطوس کے مکان میں گھس گیا اور سونے اور چاندی کا آدھا سامان جو کسی دعوت کے لئے میزوں پر رکھا تھا اٹھا لایا تو اس دوست نے بھی اسے معاف کر دیا تھا۔ انیطوس نے اپنے مہمانوں سے کہا کہ ہمیں اس کا احسان مند ہونا چاہیے کہ اس نے ہمارے لئے آدھا سامان ہی چھوڑ دیا۔

لوگوں کا خیال تھا کہ یہ کہانی پرلطف تو تھی لیکن تکلیف دہ بھی تھی۔ یہ داستان مزے لے لے کر سنتے تھے۔ ایلسی بیاڈیز نے مصورا گاتھرکس کو اپنے مکان میں اس وقت تک بند رکھا۔ جب تک اس نے تمام دیواروں کو تصاویر سے مزین نہیں کر دیا۔ جب ایلسی بیاڈیز کی بیوی عدالت میں طلاق لینے آئی (اور واقعی بے چاری کو طلاق لینے کا حق پہنچتا تھا) تو وہ اسے اپنے کندھے پر ڈال کر گھر لے گیا۔ ایتھنز کے تمام لوگ قانون شکنی کی یہ داستان سنتے تھے تو ان کے دل میں کسی حد تک ایلسی بیاڈیز کے لئے احترام کے جذبات ضرور پیدا ہوتے تھے۔ البتہ سقراط نے اس کی ان حرکات کو کبھی اچھا نہ سمجھا۔ یہ بڑی افسوس ناک بات تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایلسی بیاڈیز کو فوراً معلوم ہو جاتا تھا کہ لوگ کیا بات پسند کرتے ہیں اور پھر وہی بات کر کے رہتا تھا جو لوگوں کو بھاتی ہو۔ اگر ایلسی بیاڈیز کے علاوہ کوئی اور اس کی گمراہی اور تباہی کا ذمہ دار تھا تو وہ ایتھنز کے لوگ تھے۔ جو سمجھتے تھے کہ معمولی سی بدقماشی میں ایک خاص لطف اور کشش ہے۔

جب ایلسی بیاڈیز سقراط کے ساتھ ہوتا تو اس کا انداز بالکل ہی

جدا گانہ ہوتا تھا۔ پوٹیڈیا کی مہم کے زمانے میں ان کا بہترین وقت ایک ساتھ گزرا تھا۔ یہ الیسی بیادیز کی پہلی جنگ تھی اور اس نے پیدل دستہ میں رہ کر اپنے دوستوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اس کے ہم رتبہ اور دولت مند نوجوانوں کے پاس گھوڑے تھے اور ان کو گھڑ سواری کی تربیت دی جاتی تھی۔ بعد میں الیسی بیادیز بھی سواروں کا افسر ہو گیا تھا لیکن اس مرتبہ وہ پیدل فوج میں شامل ہوا تھا اور سقراط کے ساتھ ایک ہی خیمہ میں رہتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنے دوست کے ساتھ رہنے کے لئے اس نے اپنے غرور اور تفوق کے احساس کو خیر باد کہہ دیا تھا۔

اس جنگ میں الیسی بیادیز نے بحیثیت سپاہی کے شہرت حاصل کی۔ پوری فوج میں سے صرف اسے بہادری کا تمغہ دینے کے لئے منتخب کیا گیا۔ اگرچہ وہ اس بات پر مصر رہا کہ تمغہ دراصل سقراط کو ملنا چاہیے کیونکہ جب وہ زخمی ہو گیا تھا تو سقراط نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اس کی جان بچائی تھی۔ یہ انعام دیا جانا بہت عزت کی بات تھی۔ ایرانیوں کے خلاف جنگ کے زمانے میں ایک ایسا ہی کارنمایاں کرنے کی بنا پر الیسی بیادیز کے ایک عزیز کو ایتھنز میں اب تک یاد کیا جاتا تھا۔ لیکن جو لوگ الیسی بیادیز کی وطنی زندگی سے واقف تھے ان کو اس کی فوجی زندگی کے معمول کو دیکھ کر اور تعجب ہوتا تھا۔ وہ دوسرے آدمیوں کی طرح لمبی مسافتیں طے کرتا، بھوکا رہتا، سردی میں ٹھٹھرتا اور سنتری کے فرائض انجام دیتا۔ وہ نہ تو شور مچاتا اور نہ کسی رعایت کا طالب ہوتا۔ شاید اسے معلوم تھا کہ فوج میں کس چیز کی تعریف کی جاتی ہے۔ یا شاید سقراط کی مدد

سے اس نے ضبط نفس سیکھ لیا تھا۔

اسی طرح ایلسی بیادیز اور سقراط نے اپنی انتہائی گہری دوستی کا ایک سال گزارا۔ جب مہم ختم ہوگئی تو دونوں ایتھنز واپس آ گئے۔ سقراط نے دیوتاؤں کے حکم کے مطابق اپنا قومی کام شروع کر دیا اور ایلسی بیادیز میدان سیاست میں داخل ہو گیا۔ فوج میں اگرچہ ایلسی بیادیز کا طرز عمل بہت ہی اچھا رہا تھا۔ مگر اب دونوں میں بُعد پیدا ہو گیا تھا۔ سیاست میں داخل ہونے کے بعد ایلسی بیادیز کو یقین ہونے لگا تھا کہ وہ سقراط کے شہر میں کبھی داخل نہیں ہو سکے گا۔ (اس کا شبہ اسے پہلے بھی تھا) اب بھی جب وہ اس شہر کو اپنے دوست کی مدد سے دیکھتا تھا تو اس کا شیفتہ ہو جاتا تھا۔ لیکن وہ اس شہر میں داخلہ کی قیمت ادا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لہذا وہ اپنے راستے پر گامزن رہا۔

افلاطون کا بیان ہے کہ تقریباً پندرہ برس کے بعد ایتھنز میں شاعر ایگاتھن کے مکان پر عشائیہ دیا گیا جس کی بہت شہرت ہوئی۔ ایگاتھن کو اپنے پہلے ڈرامہ کی تصنیف پر انعام ملا تھا اور اپنی کامیابی پر گویا اس نے جشن منایا تھا جو لوگ مدعو کیے گئے تھے وہ سب ممتاز اور معروف تھے۔ دعوت میں طربیوں کا مصنف ارسٹوفینز، سقراط کا دوست ارسٹوڈیمس (جس نے بعد میں یہ واقعہ بیان کیا) اور سقراط بذات خود شریک تھے۔ ایلسی بیادیز مدعو نہ تھا۔ وہ کماندار اور صف اول کا سیاست دان تھا۔ ہونے والے اولمپک کھیلوں میں حصہ لینے کے لئے وہ چار گھوڑوں والی سات ٹیمیں تیار کر رہا تھا۔ لیکن وہ سقراط سے ملنے سے کتراتا تھا۔

دستور کے خلاف مہمانوں نے ایگاتھن کی دعوت کے بعد نہ تو گانا گایا۔ نہ کوئی کھیل دیکھا نہ غلاموں ہی کے کھیل تماشوں سے محظوظ ہوئے۔ یہ ظرین اور مسخصین کی دعوت تھی۔ بانسری بجانے والوں کو رخصت کر دیا گیا اور محفل میں بلند معیار کی گفتگو شروع ہو گئی۔ محبت کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ ہر شخص نے اپنے پیشہ اور خیال کے مطابق مزاحیہ، علمی یا شاعرانہ انداز میں اپنی رائے ظاہر کی۔

سقراط نے اپنی تقریر میں کہا کہ محبت دو دوستوں کے درمیان ایک ایسی چیز کا کام دیتی ہے جو ان کو نیکی کے نئے مناظر دیکھنے کے لئے بلندیوں پر لے جاتی ہے۔ تقریر ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ ایک دم سے بانسریوں کی آوازیں آنے لگیں اور دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ ایگاتھن نے غلاموں کو بھیجا کہ دریافت کریں کیا معاملہ ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ایلسی بیادیز کی آواز صحن سے آئی۔ وہ بے تحاشہ پئے ہوئے تھا۔ وہ چلا رہا تھا۔ ایگاتھن کہاں ہے؟ مجھے ایگاتھن کے پاس لے چلو۔ آخر کار بانسری بجانے والی لڑکی اور اپنے خدمت گاروں کے سہارے سے وہ ایگاتھن کے پاس پہنچ گیا۔

وہ کسی دوسری دعوت سے واپس آ رہا تھا۔ ایگاتھن کے گھر اس کے داخلے کا منظر دیدنی تھا۔ بانسری بجانے والی لڑکی اس کی بغل میں تھی اور اس کے ملازم اس کے چاروں طرف حلقہ زن تھے اور اس کے سر پر عشق پیچاں اور بنفشہ کے طرے تھے اور رنگ برنگے فیتے لپٹے ہوئے تھے۔

"شب بخیر۔ میرے دوستو۔" اس نے کہا۔ "کیا تم ایک نشہ میں

بدمست آدمی کو اپنی محفل میں شریک کرو گے۔ یا میں اگاتھن کو یہ ہار پہنا کر چلا جاؤں کیونکہ میں صرف اسی لئے تو آیا ہوں۔"

مہمانوں نے ایک آواز ہو کر اس سے ٹھہرنے کو کہا اور اگاتھن نے بڑی خوشی سے اسے مدعو کیا۔ اس کے آدمی اسے پکڑ کر آگے لائے اور اسے اگاتھن اور سقراط کے درمیان بٹھا دیا۔ اگاتھن نے نوکروں سے کہا "ان کے چپلیں اتار دو اور ان کو ہمارے درمیان آرام سے بٹھا دو۔"

"یہ تو ہوا۔ لیکن یہ دوسرا آدمی کون ہے۔ السی بیادیز نے پوچھا۔ وہ اگاتھن کو ہار پہنانے میں اتنا مشغول تھا کہ اس نے سقراط کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ تھم کر جب اس نے سقراط کو دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔

اس نے کہا ہراکلیس کی قسم۔ سقراط تم یہاں! یہ تمہاری پرانی چال ہے کہ وہاں میری گھات میں بیٹھے رہتے ہو جہاں تم سے ملنے کا وہم تک نہ ہو۔ اگاتھن تم اپنے کچھ ہار واپس کر دو۔ میں انہیں اس حیرت انگیز شخص کے گلے میں ڈالنا چاہتا ہوں جسے تمہاری طرح صرف ایک بار کامیابی نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ ہوتی رہتی ہے۔" اس نے اگاتھن کے گلے سے کچھ ہار اتار کر بڑی عقیدت سے سقراط کے گلے میں ڈال دیئے۔

"تم لوگ محبت کی تعریف میں تقریریں کر رہے تھے۔" وہ بولا۔ "میں بہت نشے میں ہوں اور کوئی تقریر نہیں کر سکتا۔ لیکن میں سقراط کی تعریف ضرور کر سکتا ہوں۔"

"تمہارا مقصد کیا ہے۔ کیا تم میرا مذاق اڑانا چاہتے ہو۔" سقراط نے

ہے۔

"خاموش رہو۔" ایلسی بیادیز نے بگڑ کر کہا۔ جب تک تم یہاں ہو میں کسی اور کی تعریف نہیں کروں گا اور اگر تم اجازت دو تو صداقت کا اظہار ہی کروں گا اور بس۔"

"میں یہی چاہتا ہوں کہ تم سچ بولو" سقراط نے کہا۔

"اچھا تو پھر میں کہتا ہوں" ایلسی بیادیز نے کہا۔ "آپ نے بازار میں وہ دیوتا کی مورتیاں تو دیکھی ہوں گی سر آدمی کے دھڑ بکرے کے، میری مراد ان بکسوں سے ہے جن کے ڈھکنے پر، بکرے کے دھڑ والا دیوتا، بانسری بجاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جب بکس کھول کر دیکھو تو اندر دیوتاؤں کی خوبصورت مورتیاں رکھی ہوتی ہیں۔ سقراط بالکل اس بکس کی طرح ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ لوگوں کو لبھانے کے لئے اسے کسی بانسری کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے الفاظ کافی ہوتے ہیں۔"

ایلسی بیادیز کو بولنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ اچھا مقرر تو خیر کبھی نہ تھا۔

اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "میں یہ بات بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ اگر میں یہ بتاؤں کہ سقراط اپنے الفاظ سے مجھ پر کیا جادو کرتا ہے تو تم لوگ کہو گے کہ میں نشہ میں بدحواس ہو گیا ہوں۔ اس کے الفاظ میرے وجود باطنی میں اضطراب پیدا کر دیتے ہیں۔ اس وقت میرا دل چاہتا ہے کہ میں چیخوں اور روؤں۔"

یہ ایک عجیب وغریب احساس ہوتا ہے۔ فارقلیس ایک زبردست مقرر تھا۔ لیکن اس کی تقریر کا مجھ پر ایسا اثر کبھی نہیں ہوا۔ اس کی باتیں سن کر مجھے کبھی اپنے آپ پر غصہ نہیں آیا کہ میں غلاموں کی طرح رہتا ہوں اور کبھی ندامت کا احساس نہیں ہوا۔ ہاں ہاں ندامت۔ تمہیں خیال ہو گا کہ مجھے تو ندامت کے معنی بھی معلوم نہ ہوں گے۔ لیکن سقراط کی باتیں سن کر مجھے ندامت کا احساس ہوتا ہے۔

''حقیقت تو یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے صحیح کہتا ہے۔ میں اس کی تردید نہیں کر سکتا۔ لیکن جوں ہی وہ میری نظروں سے اوجھل ہوتا ہے پھر مجھ پر تحسین کی محبت کا جذبہ غالب آ جاتا ہے۔ اسی لئے میں اس سے بھاگتا ہوں لیکن بعد کو پھر جب میں اسے دیکھتا ہوں تو شرمندہ ہوتا ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے آج کی رات ہو رہا ہوں۔ اکثر میں دعا مانگتا ہوں کہ وہ مر جائے لیکن اس کے مرجانے کے بعد تو مجھے اور بھی اذیت ہو گی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں سقراط کا کیا علاج کروں۔''

الیسی بیاویز، سقراط اور ایگاتھن کے درمیان گدے پر لیٹا وہ سب کچھ کہہ رہا تھا جو کچھ اس نے آج تک کسی سے نہیں کہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ عشق پیچاں اور بنفشے کے پھولوں کے طرے، اس کے سر سے کھسک کر، ماتھے پر آ پڑے تھے اور مضحکہ خیز معلوم ہوتے تھے۔ اس نے بتایا کہ میں نے سقراط کے راز کو جاننے کے لئے اس کا پیچھا کیا اور پوٹیڈیا میں ہم دونوں ایک سال تک ایک ساتھ رہے۔ لیکن ہر پھر کے آخر وہ سقراط کی اسی عجیب

بات کا تذکرہ کرنے لگتا تھا جو اس کے الفاظ میں پوشیدہ تھی۔

اس نے کہا۔ ''بکس کی طرح اس کے الفاظ بھی بدشکل ہیں۔ وہ ہمیشہ لوہاروں، موچیوں اور چمڑا رنگنے والوں کے بارے میں باتیں کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس سے واقف نہ ہو تو شاید اس کا مذاق اڑانے لگے لیکن بکس کو کھولو تو معلوم ہوگا کہ دوسرے الفاظ بے معنی ہیں۔ اس کے الفاظ نیکی کی مورتیوں، تصویروں سے بھرپور ہیں۔'' ایسی تصویریں جو زندگی کی طرح بھرپور اور بڑی تھیں۔

تقریر ختم کرتے ہوئے اس نے کہا۔

''میں سقراط کی تعریف کر چکا ہوں لیکن اس کے ہاتھوں تکلیف اٹھانے والوں میں ایک میں ہی نہیں ہوں۔ ایگاتھن ہوشیار رہنا۔ نہیں تو وہ تمہیں بھی اپنے جال میں گرفتار کرے گا۔''

اس تقریر کے بعد خوب ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد چند شرابی سڑک پر سے اندر گھس آئے اور محفل درہم برہم ہوگئی۔ صرف سقراط، المیوں کا مصنف ایگاتھن اور طربیوں کا مصنف ارسٹوفینیز ٹھہر گئے اور صبح تک باتیں کرتے رہے۔ ارسٹوڈیمس جو اس قصہ کا راوی ہے۔ سارے وقت سوچتا رہا لیکن اسے یہ یاد رہا کہ سقراط دونوں مصنفوں سے یہ بات منوانا چاہتا تھا کہ بنیادی طور پر طربیہ اور المیہ ایک ہی ہیں اور یہ کہ الم انگیز اشعار کہنے والے کو طرب افروز اشعار بھی کہنے چاہئیں۔ وہ دونوں سقراط کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے کہ وہ برابر اونگھ رہے تھے اور آخر کار سو گئے۔ ارسٹوفینیز پہلے سو گیا اور ایگاتھن عین طلوع صبح کے

وقت۔ اس کے بعد سقراط گھر چلا آیا۔ ارسٹوڈیمس اس کے ساتھ تھا۔ دونوں ورزش گاہ گئے۔ جہاں سقراط نے ہاتھ منہ دھویا اور حسب معمول دن گزار دیا۔ شام کو وہ اپنے گھر سونے چلا گیا۔

افلاطون کی کہانی یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ ایک سال بعد ایلسی بیادیز پر الوس کے رموز و اسرار اور مراسم مذہبی کی نقل اتارنے اور توہین کرنے کا الزام لگایا گیا۔ یہ مراسم مذہبی، ایتھنز میں سب سے زیادہ متبرک سمجھے جاتے تھے اور نہایت احتیاط سے مخفی رکھے جاتے تھے۔ ایلسی بیادیز کو موت کی سزا دی جا سکتی تھی۔ اس وقت وہ صقلیہ میں کمان دار کے عہدے پر مامور تھا۔ اسے جرأت نہ ہوئی کہ وطن آ کر عدالت کے سامنے پیش ہو۔ اس لئے وہ دشمن سے جا ملا۔ بعد میں جب صقلیہ سے واپسی پر ایتھنز کی فوج نرغہ میں گھر گئی اور ایتھنز کے ہزاروں نوجوان یا تو مارے گئے یا قید ہو گئے تو معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ ایلسی بیادیز کے مشورے کے مطابق ہوا ہے۔ اس نے اسپارٹا والوں کو ضروری معلومات بہم پہنچائی تھیں۔ اور جب ایتھنز کے رہنے والوں نے اپنی دیواروں پر سے اسپارٹا کے حملہ آوروں کو ڈسیلیا کے سرحدی قلعے سے نکل کر، کوچ کرتے دیکھا تو وہ سمجھ گئے کہ یہ کام بھی ایلسی بیادیز کے مشورے سے ہوا ہے۔

ایتھنز والوں نے ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ پھر اسے معاف کر دیا۔ پھر جب وہ از سر نو ایتھنز والوں کا حامی ہو کر جنگ میں شریک ہوا تو چار ماہ کے قریب شہر میں رہا۔ اس نے کئی شاندار فتوحات حاصل کیں۔ لیکن اس کی تمام ذہانت اور دانائی بالآخر اکارت گئی۔ کیونکہ اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس کے بحری بیڑے کو شکست ہوئی تو ایتھنز والوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ جنگ
نے جان بوجھ کر ہاری ہے۔

ختم ہونے سے پہلے ہی اسے جلا وطن کر دیا گیا اور جلا وطنی کی
اس نے تھریس کے وحشیانہ اور غیر مہذب علاقے میں بسر کی۔ وہ ساحل
ہوا تھا اور ایتھنز کی بحری فوج تباہ ہو رہی تھی لیکن وہ بے بس تھا۔ اس کے
اس نے کوشش کی کہ بھاگ کر ایران جا پہنچے کہ شاید وہاں پناہ مل جائے۔
وہ راستے میں پکڑا گیا اور مار ڈالا گیا۔ جب وہ مرا تو کوئی بھی اس کا
دوست نہ تھا۔ اس کی میراث صرف ان صلاحیتوں کی داستان سے عبارت ہے
ہو گئیں۔ وہ وقتی جذبے کا غلام تھا لیکن اگر یہ فیصلہ کر لیتا کہ میں آزاد ہو
رہوں گا تو اس کی زندگی قابل قدر اور ستائش و تکریم کی سزاوار ہوتی۔

جنگ عظیم

وہ زمانہ جس نے ایلسی بیادیز کو جلیل القدر ہیرو کی طرح نمایاں ہوتے اور پھر ناکام ہوتے دیکھا تھا، وہی تھا جب افلاطون شباب کی منزلوں میں قدم رکھ رہا تھا اور سقراط دیوتاؤں کے پیغام کی تبلیغ میں مشغول تھا۔ یہ اسپارٹا والوں سے جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ جب جنگ عظیم شروع ہوئی تو سقراط تقریباً اڑتالیس برس کا تھا۔ جب جنگ ختم ہوئی تو اس کی عمر تقریباً چھیاسٹھ برس کی تھی۔

ہر سال ایتھنز کی فوج گرمیوں میں میدان جنگ کو روانہ ہوتی تھی اور بحری بیڑے دور دراز مقامات کو جاتے تھے۔ ہمارے علم کے مطابق سقراط دو جنگوں میں ضرور شریک ہوا۔ عین ممکن ہے کہ وہ اور لڑائیوں میں بھی شریک ہوا ہو۔ زن تھپی کتنی ہی بار سونے کے کمرے سے اس کے صندوق میں سے برنز کا خود اور چار آئنے لے کر آئی ہو گی اور اسی طرح بیٹھک کی دیوار سے نیزہ اور ڈھال اتار کر شوہر کے حوالے کیے ہوں گے۔ زن تھپی کو یہ بھی دیکھنا تھا کہ چار آئینے کے جوڑ ٹھیک بیٹھتے ہیں کہ نہیں۔ شانہ بند ٹھیک کام کر رہے ہیں کہ نہیں۔ پھر گھوڑے کے بالوں کا طرہ بنا کر خود میں ٹھیک طرح سے جمانا تھا۔ اب یوں سمجھ لیجیے کہ کام شروع ہو رہا ہے۔

احاں کو اچھی طرح چمکایا جاتا ہے کہ توڑ پھوڑ کے باوصف شیشہ کی طرح درخشاں ہو جاتی ہے۔ زن ٹیپی سقراط کا پرانا لبادہ دھوتی اور رفو کرتی ہے سقراط اصرار کرتا ہے کہ وہ ٹھیک ہے۔ لیکن وہ نہیں چاہتی کہ دوسرے مردوں کے مقابلہ میں اس کی ہیٹی ہو۔ کپڑے درست کرنے کے بعد وہ تین دن کا کھانا اس کے لئے باندھ کر تیار کرتی ہے۔ خشک مچھلیاں، زیتون، جو کی روٹیاں اور پنیر۔ وہ سقراط کے ساتھ شہر کے پھاٹک تک جاتی ہے تاکہ فوج کے کوچ کرنے کا نظارہ دیکھ سکے۔ جب اس کا پہلا بچہ ہوا، دیر کے بعد، منتیں مانگ کے تو ظاہر ہے کہ وہ اسے بہت پیار کرنے لگی اور ایسے موقعوں پر کندھے پر بٹھا کر اپنے ساتھ لے جانے لگی۔

زن ٹیپی کی زندگی بھی آرام سے نہیں گزری۔ معلوم نہیں سقراط نے اس سے کب شادی کی تھی۔ لڑائی چھڑنے سے پہلے یا اس سے برسوں بعد۔ سقراط نے ایتھنز کے مروجہ دستور کے مطابق کسی مشاطہ یا رشتہ دار عورت کے ذریعہ شادی طے کرائی تھی۔ وہ شاید کسی پڑوسی کی لڑکی ہو جسے اس نے گھر سے گھڑا لے کر کنوئیں پر جاتے محلہ میں دیکھ لیا ہو۔ لیکن شادی سے پہلے دونوں ایک دوسرے سے واقف نہیں تھے۔ سقراط نے اس سے بچوں کے لئے شادی کی تھی اور زن ٹیپی نے بھی سقراط سے اس لئے شادی کی تھی کہ وہ سمجھتی تھی میری تقدیر ہی یہی ہے کہ بیاہی جاؤں۔ بچے پیدا کروں اور گھر پر حکمرانی کروں۔ اگرچہ وہ ننگی سا تھا اور بدصورت بھی پھر بھی اس کو یہ امید تھی کہ وہ اسے اطمینان اور شفقت عطا کر سکے گا۔ وہ عمر میں اس سے بہت چھوٹی تھی۔

سقراط زن ٹیپی پر بہت مہربان تھا۔ شاید وہ ایک دوسرے سے کچھ محبت بھی کرتے تھے۔ اگرچہ دونوں میں مشترک دلچسپی کی چیزیں بہت کم تھیں۔ ایتھنز میں زن و شوہر عام طور سے ایک دوسرے کی دلچسپیوں میں شریک ذرا کم ہی ہوتے تھے۔ بہرحال جب وہ ناراض ہوتی تو سقراط خاموش رہتا تھا۔ زن ٹیپی لعنت ملامت بہت کیا کرتی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کی نیت بری نہیں لہٰذا وہ اس کے غصہ پر مسکرا کر دوسرے کاموں میں مشغول ہو جاتا تھا۔ وہ بچوں سے کہتا تھا "اس کے الفاظ سے تم کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ تم دیکھتے نہیں کہ جب تم بیمار پڑتے ہو تو وہ کس طرح تمہاری تیمارداری کرتی ہے۔"

سقراط اگرچہ اسے اطمینان نہیں دے سکا لیکن وہ اس پر مہربان ضرور تھا اور پھر اس کے بچے بھی ہوئے۔ اس کے تین لڑکوں کے نام ہم جانتے ہیں۔ پروکلیز، سوفرانکس اور سب سے چھوٹا مے نکوزیس۔ شاید لڑکیاں بھی پیدا ہوئیں۔ لیکن ان میں سے کوئی زندہ نہ رہی۔ پچاس سال سے پہلے سقراط کے جتنے بچے ہوئے، سب مر گئے۔ لیکن اس کی آخری عمر میں اس کا خاندان اچھا خاصا تھا اور اس کی وجہ سے سقراط کو بہت اطمینان قلب نصیب تھا۔ مرنے سے ایک رات پیشتر اس نے خواہش ظاہر کی تھی کہ زن ٹیپی اس کے پاس رہے۔

زن ٹیپی اور بچوں کے علاوہ سقراط کے دوست بھی تھے۔ پرانے اور نئے دوست۔ لڑائی کے زمانہ میں ایک بالکل نئی پود بڑھ کر جوان ہوئی تھی۔ کرائٹو کا لڑکا کرائٹو بولس تھا۔ زینوفن نامی ایک خوش مزاج نوجوان جسے گھوڑوں اور کتوں کا بے حد شوق تھا، اکثر اس کی باتیں سننے کو ٹھہر جاتا تھا۔ پھر مشہور

یونانی شاعر ایک شخص تھا جس کے مشہور عشائیہ کا ذکر آچکا ہے۔ اس کے علاوہ
سفالیس تھا (سسلیہ کا رہنے والا) جس کا ڈھال بنانے کا کارخانہ تھا۔
ساحل پر اس کے مکان میں بھی ایک زبردست مباحثہ ہوا تھا۔ افلاطون کی ماں
کے عزیزوں میں قریطیاس اور کارمیڈیز تھے۔ یہ دونوں بعد میں انقلاب کے
رہنما ہوئے اور ایلسی بیادیز کی طرح سقراط کی نیک نامی کے لئے خطرہ بن گئے
تھے پھر افلاطون کے بڑے بھائی گلاوکن اور ایڈی مانٹس تھے اور جنگ کے
اختتام پر افلاطون خود اس کے دوستوں کے حلقہ میں شامل ہو گیا تھا۔

افلاطون کو اچھی طرح یاد نہیں تھا کہ اس نے سقراط کا ذکر اپنے گھر میں
کب سے سننا شروع کیا تھا۔ جب وہ اس قابل ہوا کہ سقراط سے بات کر سکے
اس سے برسوں پہلے وہ سقراط کے متعلق سنتا چلا آیا تھا۔ سقراط کے حلقہ میں
شامل ہونے کے بعد بھی مدت تک وہ ایک کونے میں بیٹھا سقراط کی باتیں سنتا
رہتا تھا۔ اگر اس زمانے میں کوئی اس سے کہتا کہ وہ ایک فلسفی ہوگا اور ایک دن
ایک مدرسہ فکر کی بنیاد ڈالے گا تو وہ کہنے والے کا مذاق اڑاتا۔ افلاطون ایک
بہت ہی بڑے خاندان کا فرد تھا۔ نامور مقنن سولن اس کے اجداد میں سے تھا اور
اگر اس سے بھی پیچھے کی طرف دیکھا جائے تو سمندر کا دیوتا پوزائیڈن اس کے
خاندان کا بانی تھا۔ افلاطون اپنے خاندان کی روایت کے مطابق سیاست دان
بننا چاہتا تھا۔ وہ زمانہ جنگ کے سیاست دانوں کی طرح عام لوگوں سے بے
تکلفی کا شیوہ نہیں اختیار کر سکتا تھا۔ ایسے لوگوں سے اس کے خاندان والوں کو
سخت نفرت تھی۔ اسے اپنے جدامجد سولن کی طرح سارے شہر کا ایک قدامت

پسند اور محب وطن قائد بننے کی تمنا تھی۔ وہ اپنی ذات میں قائد بننے کی صلاحیتیں محسوس کرتا تھا اور اس کا ماموں قریطیاس قدامت پسندوں کی حکومت آتے ہی اسے سیاست کے میدان میں لانے کو تیار تھا۔

فی الحال وہ مصوری اور شاعری سیکھ رہا تھا۔ اس زمانہ میں شعر گوئی کے لئے یونانی میں شعر سازی کا کلمہ مستعمل تھا۔ جس طرح سقراط کے لئے تحقیق کا کام جاری رکھنا ضروری تھا اسی طرح افلاطون کے لئے بھی کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا وہ ابھی قانون ساز نہیں تھا اس لئے تمثیل سازی ہی سے دل بہلاتا تھا۔ ایک مشکوک سی روایت ہے کہ جب وہ اپنا ڈراما لکھ چکا تو سقراط کے الفاظ جو پہلے صرف اس کی ذہن کی سطح کو چھو پاتے تھے اب اس کے دل کی چبھن بن گئے اور اسی بنا پر اسے اپنے تمام پہلے کے افکار و اعمال بے ثمر سے معلوم ہونے لگے۔ معاملہ ایلسی بیاڈیز سے گزرا تھا۔ افلاطون نے محسوس کیا کہ اس کا ڈرامہ کچھ گھٹیا سا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی تصنیف کو نذر آتش کر دیا۔ اس کے بعد اس نے بہت دنوں تک کوئی ڈرامہ نہیں لکھا اور جب لکھا تو اس کا اسلوب بالکل نیا تھا۔ یہ نیا اسلوب اس نے سقراط سے سیکھا تھا۔

اگرچہ سقراط کو اس بات کا شعور نہ تھا کہ حقیقت یہ ہے کہ ایلسی بیاڈیز کی صلاحیتوں کا اکارت جانا اتنا اہم نہیں تھا جتنی یہ بات کہ افلاطون سقراط کے دائرہ اثر میں داخل ہو جائے اور پھر جنگ کے سال ایتھنز میں کسی کے لئے بھی آرام و سکون کے سال نہیں تھے۔ خصوصاً ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کے لئے جسے قلیل آمدنی کے باوجود ایک پورے خاندان کا بار سنبھالنا پڑتا تھا اور جس کی

خلاقی قدریں زمانہ امن کی اخلاقی قدروں سے بھی زیادہ بلند تھیں اور جسے اپنے مقصد کے لئے جہالت اور ظلم کا تن تنہا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ بعض اوقات تو سقراط پر اس کے خاندان والوں کے لئے زندہ رہنا مشکل ہو جاتا تھا۔ لڑائی کے زمانہ میں اور طاعون کے زمانہ میں، جو لڑائی سے زیادہ مہلک تھا، ہر ضروری چیز کی قلت ہو گئی تھی۔ نہ ایندھن ملتا تھا نہ رہنے کو گھر نہ خوراک، جنگ کے اختتام پر لوگوں کو بھوک کے طویل مہینے گزارنے پڑے۔ شہر پناہ گزینوں سے بھرا ہوا تھا اور اسپارٹا کا بحری بیڑا ایرانی سونے کے بل بوتے پر فاسفورس سے لے کر بحیرہ سلامینر تک سمندری ناکہ بندی کئے ہوئے تھا۔ اس زمانہ میں غلہ کا کوئی جہاز نہیں آ سکتا تھا اور خوراک کی کمی کی بنا پر بازار بند ہو گئے تھے۔

سقراط اور زان تھپی نے بھی جنگ، افلاس اور فاقوں کے دن گزارے۔ دوسرے خاندان بھی کسی نہ کسی طرح زندہ رہے۔ لیکن جو چیز اس زمانہ کے مفکرین کے لئے رستا ہوا ناسور تھی اور جس نے سقراط کے کام کو اور بھی ضروری بنا دیا تھا وہ اس تبدیلی کا احساس تھا جو لوگوں کے دلوں میں مصائب اور غارت گری کی بنا پر رونما ہو رہی تھی۔ جنگ بیس سال تک جاری رہی اور جو صلح کا عارضی وقفہ آیا اس میں لوگوں کو کوئی کام کرنے کی مہلت نہ ملی۔ مروجہ آداب و اخلاق کی شکست و ریخت کا عمل تیزی سے جاری تھا۔ پہلے فارقلیس کے اس خیال پر ایتھنز والوں کا اعتماد تھا کہ اس شہر کے لوگ ہر خوبصورت اور شاندار بات کر سکتے ہیں (چاہے عارضی طور پر ان کے ہمسایوں کی کچھ حالت کیوں نہ ہو جائے) اس کی جگہ ایلسی بیادیز کا نظریہ زیادہ مقبول ہو رہا تھا کہ جس کی لاٹھی

اس کی بجینیس والی بات ہے ماضی کے پر سکون سالوں کی بنا میں ایک مہلک شگاف تھا۔ (فارقلیس اور اس کے معاصروں نے اس شگاف کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں) یہ شگاف اس عقیدہ سے عبارت تھا کہ مقصد نیک ہو تو برے وسائل بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ اب یہ شگاف، یہ نظریہ شہر کی بنیادوں کو متزلزل کر رہا تھا۔ مثلاً اسی واقعہ پر غور کر لیجئے کہ پورے شہر نے صاف طور پر اور بڑی سرد مہری سے ایوان میں یہ تجویز منظور کر لی کہ چھوٹے سے بے بس جزیرے میلوس کے تمام مردوں کو قتل کر دیا جائے اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے۔ اسی طرح جب ایتھنز والوں نے طاعون کے زمانہ میں اپنے بیمار اعزا کی تیمارداری کرنا چھوڑ دی اور انہیں مناسب طریقے سے دفن کرنا چھوڑ دیا تو یہ بھی ایک بری علامت تھی۔ فارقلیس کے زمانے کے لوگوں پر یہ حرکتیں شاق گزرتی تھیں۔ لیکن ایلسی بیادیز کے زمانے کے لوگ اور ان کے معلم جو نوجوان سوفسطائی تھے، کہتے تھے کہ ان باتوں کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ سوفسطائی کہتے تھے کہ راستی اور ناراستی کے پرانے قوانین گذشتہ زمانے میں کمزور انسانوں نے بنائے تھے اور طاقتور آدمیوں کو ان کا پابند نہیں ہونا چاہیے۔ قانون فطرت جانوروں کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے اور اگر انسانوں میں ہمت ہو تو وہ بھی اس قانون پر عمل کریں کہ اپنی جان بچاؤ اور جس چیز کی تمہیں ضرورت ہو لے لو۔

ایتھنز کے مہذب اور تربیت یافتہ لوگ سوفسطائیوں کی تعلیم سے خوفزدہ تھے اور اس کا تدارک کرنا چاہتے تھے۔ سقراط ایک دن انیطوس سے ملا۔ یہ اس کا وہی دوست تھا جس کے کھانے کا آدھا ساز و سامان ایلسی بیادیز ایک

موت سے پہلے اٹھا کر لے گیا تھا اور جس نے اس بات کو ہنس کر ٹال دیا تھا لیکن اب انیطوس ہنستا نہیں تھا۔ اس نے سقراط سے کہا کہ سوفسطائیوں کو شہر سے نکال دینا چاہیے۔

سقراط نے پوچھا "تم نے کبھی یہ جاننے کی کوشش کی کہ ان کی باتوں کا مقصد کیا ہے؟"

"مجھے اس کی ضرورت نہیں" انیطوس نے جواب دیا۔ "اور سقراط تم بھی ذرا اپنا خیال رکھو۔ کیونکہ تم بھی شہر میں ہر جگہ ہمارے مدبرین پر نکتہ چینی کرتے پھرتے ہو۔ یہ بہت خطرناک بات ہے۔"

ایتھنز میں انیطوس تنہا شخص نہیں تھا جو سقراط کو بھی سوفسطائی سمجھتا ہو۔ شاعر ارسطو فنیز نے جب سوفسطائیوں کے خلاف اپنی مشہور طربیہ تمثیل "بادل" لکھی تو اس نے سقراط کو تمثیل کا خبیث ترین کردار بنا کر پیش کیا۔ اس میں سقراط کو سوفسطائیوں کے "کارخانہ فکر" کا معلم دکھایا گیا تھا۔ اس کارخانہ میں ایک نوجوان آدمی کو سکھایا جاتا تھا کہ وہ دیوتاؤں کے وجود سے انکار کرے۔ اپنے والدین پر اعتراض کرے اور بحث کر کے اپنے آپ کو قرض سے نجات دلائے۔ یہ کھیل دیکھ کر لوگ خوب ہنسے۔

اس وقت تو لوگ ہنستے رہے۔ لیکن ان کو وہ ڈراما یاد رہا اور یہی بعد میں سقراط کے لئے مصیبت کا باعث بنا۔ اکثر لوگوں کو یہ بات نظر نہیں آئی کہ سوفسطائیوں سے قرار واقعی طور پر صرف وہی نپٹ سکتا تھا جو کچھ انیطوس چاہتا تھا وہ تو ناممکن تھا۔ کوئی شخص پرانی روایات پر اعتراضات کو روک نہیں سکتا تھا۔ لیکن

سقراط اعتراض کرنے والوں کو اچھے جواب دے سکتا تھا۔ اس نے سیاست داں کالیکلو سے پوچھا۔ ''کیا تم مریض جسم لے کر ساری زندگی بسر کر سکتے ہو؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے تو سوچ لو مریض روح لئے پھرنا کس قدر ناگوار ہوگا؟''

سوفسطائی تھریسائی ماکوس سے، جو دعویٰ کرتا تھا کہ بدی نیکی سے زیادہ طاقتور ہے، سقراط نے پوچھا ''تھریسائی ماکوس! کیا تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ کون سی شے انسانوں کو ایک دوسرے سے منسلک رکھتی ہے؟ اگر ڈاکوؤں میں بھی عدل و انصاف کا شعور کارفرما نہ ہو تو کیا وہ منظم اور طاقت ور رہ سکتے ہیں؟ اگر ان میں سے ہر ایک دوسرے کا مال چرانے لگے تو انہیں کتنا فائدہ ہوگا؟ پھر اس شہر کا کیا انجام ہوگا جسے بدی گروہوں میں بانٹ دے یا اس روح پر کیا بیتے گی جس میں متضاد اور غیر مرتب عناصر کارفرما ہوں۔ یقین مانو کہ بدی کا نتیجہ طاقت نہیں بلکہ کمزوری ہے۔''

جب شہر سے باہر ایک فوج دوسری فوج سے جنگ آزما تھی اور لوگوں کے ذہنوں میں نیکی اور بدی کی جنگ جاری تھی۔ اس وقت سقراط کو تن تنہا اتنا کام کرنا پڑتا تھا کہ دو معمولی آدمی بھی حل کر نہ کر سکتے تھے۔ وہ نشان ربانی کے ایما کے مطابق سیاست سے الگ رہا لیکن اس کی حیثیت ایسی تھی کہ اس پر نظریں پڑتی ہی تھیں۔ لڑائی جب ختم ہو رہی تھی اس وقت اسے دوبار قومی معاملات میں الجھنا پڑا اور دونوں بار گویا اس کی جان پر بن گئی۔

پہلا واقعہ تو یوں ہے کہ ایشیائے کوچک کے ساحل کے قریب ارجینوسی

کے مقام پر ارگنے کی تول بحری لڑائی لڑی گئی۔ ایتھنز کے تقریباً سب لوگ خواہ آزاد ہوں یا غلام۔ جو پتوار چلا سکتے تھے یا اسلحہ اٹھا سکتے تھے، اس جنگ کے لئے جہاز پر بٹھا کر روانہ کر دیئے گئے۔ سقراط جس کی عمر اس وقت ساٹھ سے زیادہ تھی، ایتھنز میں نگہبانی کے فرائض انجام دینے کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا لیکن اس کا نوجوان دوست افلاطون اس جنگ میں فتح یابی یا ذلت میں شریک ہونے کے لئے فوج کے ساتھ گیا تھا۔ جنگ کے بعد جس وقت کماندار آپس میں بحث کر رہے تھے کہ زخمیوں کو کون اٹھائے اور شکستہ جہازوں کو، جو لہروں کے رحم و کرم پر تھے، بچا کر لائے، ایک طوفان آیا اور آخر کار کوئی شخص بھی بچایا نہ جا سکا۔ اس طوفان میں کم از کم بارہ جنگی جہاز غرق ہو گئے۔ انہیں یوں بنایا گیا تھا کہ مسافروں کی حفاظت زیادہ ملحوظ نہیں تھی بلکہ تیز رفتاری مدنظر تھی۔ ان جہازوں میں نہ تو جان بچانے والی کشتیاں تھیں اور نہ حفاظتی پیٹیاں۔ یہ جہاز ساحل کے قریب لوگوں کے دیکھتے دیکھتے ڈوب گئے۔ ڈوبنے والوں کی مدد کے لئے کوئی جہاز بھی ساحل کی پناہ چھوڑ کر طوفانی سمندر کی لہروں میں نہ اترا۔

فتح، طوفان اور جانی نقصان کی خبر لے کر جب کمان داروں کے خطوط ایتھنز پہنچے تو لوگوں کے صدمے اور غصے کی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے ان نو کمانداروں سے فوج کی کمان لے لی اور انہیں وطن واپس بلایا تاکہ ان پر مقدمہ چلایا جا سکے۔ اس وقت تک ایک کمان دار مر گیا تھا اور دو آئے نہیں۔ باقی چھ کماندار جن میں ایک فارقلیس اور اسپاسیا کا لڑکا تھا اور بقیہ پانچ بھی مشہور سرکاری عہدے دار تھے واپس آئے۔ انہیں حکم دیا گیا کہ ابتدائی تفتیش کے لئے

وہ پانچ سو نمائندوں کی مجلس کے سامنے پیش ہوں۔

پانچ سو نمائندوں کی مجلس بڑی مجلس منتظمہ تھی جو ایوان کے سامنے کارروائی پیش کرنے کے انتظامات کرتی تھی۔ اتفاق سے اس سال سقراط بھی قرعہ اندازی کے ذریعہ مجلس کا رکن منتخب کر لیا گیا۔ اس سے بھی زیادہ بڑی بات یہ تھی کہ وہ مجلس کے ان پچاس ارکان میں سے تھا جنہیں اس مہینہ صدارت کے فرائض انجام دینا تھے۔ وہ ان دنوں مہندی کے پتوں کا ٹکٹ لگائے پھرتا تھا (کہ یہی عہدیدار کی پہچان تھی) تمام دن ایوان شہر میں رہتا تھا۔ صدارت کرنے والے نمائندے یہیں اپنا اجلاس کرتے تھے اور یہیں اپنا کھانا کھاتے تھے۔ (زن ٹیپی اپنے دل میں کہتی ہو گی کہ چلو کچھ بچت تو ہوئی) بلکہ یہیں رات بھی بسر کر دیتے تھے کہ جو صدر منتخب ہوئے تھے ضروری تھا کہ ان میں سے کچھ ہنگامی حالات سے نپٹنے کے لئے ہر وقت یہاں حاضر رہیں۔

کونسل کے روبرو سوال جواب ہونے کے بعد چھ کمانداروں کو ایوان کے سامنے پیش کیا گیا اور اب جوش و خروش کا مرحلہ آن لگا۔ جس شخص نے الزامات لگائے تھے وہ تھیرامنیز نامی ایک بحری کپتان تھا۔ یہ شخص بڑا ہی موقع پرست سیاست دان تھا۔ اسے شاید ان لوگوں نے کافی دیر کے بعد حکم دیا تھا کہ جا کر لوگوں کی جان بچائے سقراط جو لوگوں کے اصل مدعا کو جان لیتا تھا اس نے بھانپ لیا کہ تھیرامنیز جانتا تھا کہ الزام کسی پر تو عائد کیا جائے گا۔ سو وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ خود ملزم بنے۔

شاید کچھ اور لوگ بھی تھیرامنیز کی ذاتی اغراض کو بھانپ گئے ہوں۔

بہر حال جب لمبی تقریریں ختم ہو گئیں اور گواہ اس طوفان کا حال بیان کر چکے جس کی بنا پر لوگوں کی جانیں نہیں بچائی جا سکتی تھیں تو اکثریت یہ سوچنے لگی کہ کمانداروں کو بری کر دیا جائے لیکن اس وقت اندھیرا ہو گیا تھا اور رائے شماری کے موقع پر لوگوں کے اٹھے ہوئے ہاتھ ٹھیک طرح نظر نہیں آتے تھے۔ پتہ نہیں کس نے مشورہ دیا کہ مقدمہ دوسرے ایوان (اسمبلی) میں پیش کرنے کے لئے پھر مجلس (کونسل) کو واپس بھیج دیا جائے۔ سہ روزہ خاندانی جشن قریب تھا اور خیال یہ تھا کہ چھٹیوں کے بعد جب مقدمہ پیش ہو گا تو اس میں کوئی جان باقی نہ ہو گی۔

اس شام کو جب سقراط اپنے گھر واپس گیا تو اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ دن بھر کے جوش و خروش کے بعد اب شہر میں سکون تھا۔ صرف ان گھروں سے بین کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جن گھروں کا کوئی مرد (بیٹا یا بھائی) سمندر میں ڈوب کر مر گیا تھا۔ وہ چلا جا رہا تھا کہ ایک دروازہ کھلا اور دو آدمی ایک شمع بردار لڑکے کے ساتھ باہر نکلے۔ انہوں نے اپنے دوست کو جو سر منڈائے سیاہ ماتمی لباس پہنے دروازے کے اندر پرچھائیں کی طرح کھڑا تھا، شب بخیر کہا اور اپنی راہ ہو لئے۔ سقراط ان دونوں آدمیوں کو جانتا تھا ان میں سے ایک مجلس (کونسل) کا بااثر رکن کلیکونیوس تھا اور دوسرا تھیرامنیز۔

تھیرامنیز لوگوں کے گھر جاتا رہا اور شہر میں چاروں طرف سیاہ ماتمی لباس نظر آنے لگے۔ خاندانی جشن میں عام طور پر بڑی رنگ رلیوں کا جشن سمجھا جاتا تھا۔ عزیزوں اور قبیلہ والوں کی دعوتیں ہوتی تھیں اور اس سال جو بچے پیدا

ہوتے تھے یا سن بلوغت کو پہنچتے تھے ان کی بڑی آؤ بھگت کی جاتی تھی لیکن اس سال اس جشن کا رنگ اور ہی تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ ان مردوں کی روحیں جو دفن نہیں کیے گئے تھے، زیر زمینی تاریکیوں کی دنیا میں آوارہ پھر رہی تھیں بے قرار اور بے تاب انتقام طلب کرتی تھیں۔ جب چوتھے دن چھ کمانداروں کے مقدمہ کے سلسلہ میں مجلس گاہ میں اجلاس منعقد ہوا تو چاروں طرف سیاہ پوش ماتم دار ہجوم کی صورت میں جمع تھے اور بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔ اس وقت کلیکزنیوس تقریر کرنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

کلیکزنیوس نے جو تجویز پیش کی وہ خلاف آئین تھی۔ سقراط کو اس وقت بڑی حیرت ہوئی اور اس سے زیادہ حیرت اس وقت ہوئی جب وہی تجویز ایوان کے سامنے پیش ہوئی۔ کلیکزنیوس نے بڑی وضاحت سے کہا "ان چھ کمانداروں کے مقدمہ میں ہم نے ناروا تاخیر کی ہے۔ کافی شہادت پیش کی جا چکی ہے اور اب ایتھنز کے ستم زدہ لوگ مطالبہ کرتے ہیں کہ ملزموں کو سزا دی جائے۔ میں اس لئے تجویز کرتا ہوں کہ ایوان اپنی رائے کا فوراً اظہار کرے۔ ووٹ کے لئے دو مٹکے رکھ دیئے جائیں۔ ایک سزا کے لئے اور ایک برات کے لئے۔ اس ووٹ پر تمام کماندار یا تو بری کر دیئے جائیں یا سب کو سزا دی جائے۔"

اگرچہ پھاٹک پر شور بہت ہو رہا تھا۔ پھر بھی مجلس میں بہت ہی طویل اور گرما گرم بحث ہوئی۔ ایتھنز کے قانون کے مطابق ہر شخص کو اپنی صفائی پیش کرنے کا حق حاصل تھا۔ مزید براں اسے یہ حق بھی حاصل تھا کہ اس کا مقدمہ

بھیجا جائے۔ پھر ماخوذ کمانداروں میں سے ایک تو بذات خود ایک شکستہ جہاز
پر تھا، وہ مردوں کی طرح کیسے ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا تھا۔

لیکن کلیکو نیوس اپنی بات پر مصر رہا۔ مجمع مشتعل ہو گیا لیکن ہر نمائندہ
یہ کہ کر اپنے آپ کو تسکین دے رہا تھا کہ اس کا تو ایک ووٹ تھا اور پھر یہ ووٹ
تو سفارش کی حیثیت رکھتا تھا اس سے مقدمہ کا فیصلہ نہیں ہو جاتا تھا۔ سقراط اور
چند دوسرے اراکین، جو کلیکو نیوس کے خلاف تھے، اقلیت میں تھے۔ مقدمہ کلیکو
نیوس کی سفارش کے ساتھ ایوان کو بھیج دیا گیا اور سیاہ پوش جلوس پیچھے پیچھے وہاں
پہنچا۔

سقراط صدر کی مسند کے قریب بیٹھا ہوا دیکھ رہا تھا کہ وہ دن ایتھنز کے
ایوان میں بھیانک رات سے زیادہ خوفناک تھا۔ اسے اپنے مخلص دوستوں اور
پڑوسیوں کے چہرے، جو نیچے سے اوپر دیکھ رہے تھے، اجنبی سے معلوم ہو رہے
تھے ابھی تقریریں شروع نہیں ہوئی تھیں لیکن یوں معلوم ہوتا تھا کہ سیاہ پوش ماتم
دار، جو تقریر گاہ کے ارد گرد حلقہ زن تھے چپکے چپکے اپنا ذہنی بکار پچھلے ہجوم کو منتقل کر
رہے ہیں نیک بوڑھا نمائندہ ارستو جی نیز، جو سقراط کے پاس بیٹھا تھا اور ساتھ
کے حلقہ انتخاب سے آیا تھا، حالت اضطراب میں اپنی چھڑی ٹٹولتا پھرتا تھا۔ اس
نے کہا "صقلیہ کی شکست کے بعد میں نے گذشتہ سالوں میں لوگوں کو اتنا مشتعل
کبھی نہیں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلیکو نیوس کی بے ہنگم تجویز رائے کے
لئے پیش کر دی جائے گی۔ ایسی حالت میں ہم کیا کریں گے۔"

پاکیزگی کی قدیم رسم ادا کرنے کے لئے دودھ پیتا خنزیر کا بچہ چاروں

طرف پھرایا گیا۔ افتتاحیہ دعا پڑھی گئی اور ایوان میں قانون کی خلاف ورزی کرنے والے پر لعنت بھیجی گئی۔ نقیب نے کللیکز نیوس کی تجویز پڑھ کر سنائی۔ کمانداروں کا ایک دوست یہ کہنے کے لئے کھڑا ہو گیا کہ تجویز ناجائز ہے لیکن اسے تقریر گاہ سے گھسیٹ کر نیچے گرا دیا گیا۔ ایک مقبول عوام مقرر نے کہا اسے بھی کمان داروں کے ساتھ مر جانے دو۔ ان سب کو ایک ساتھ سزائے موت دی جائے۔'' مجمع نے شور مچا کر اس تجویز پر صاد کیا۔

اس دوران میں ایک ملاح کو، جس کا بیان تھا کہ وہ اپنے مردہ ساتھیوں کا پیغام لے کر آیا ہے، تقریر گاہ پر چڑھا دیا گیا۔ اس نے کہنا شروع کیا ''لڑائی کے بعد گھنٹوں تک میں خود پانی میں رہا ہوں۔ میں آٹے کے ایک پیپے کو تھامے تیرتا رہا۔ اس لئے بچ گیا۔ میرے دوستوں نے مرنے سے پہلے مجھ سے کہا تھا کہ تم ایتھنز کے لوگوں سے کہنا کہ ہم جنگ ختم ہونے کے بعد مرے ہیں۔ اس لڑائی کے بعد، جس میں ہم نے ان کے لئے اپنی جانوں کی بازی لگا دی تھی، ہم ان کمانداروں کی غفلت کی وجہ سے مر گئے۔'' ملاح کے چہرے پر آنسو بہ رہے تھے اور مجمع چلا رہا تھا۔ کماندار مجرم تھے یا معصوم، ان کے بچنے کی اب کوئی امید نہیں تھی۔

سقراط چونکہ تقریر گاہ سے نزدیک تھا دیکھ رہا تھا کہ کیسی فاش غلطی ہو رہی ہے۔ وہ مجمع میں تقریباً ہر شخص کو جانتا تھا۔ بحیثیت مجموعی وہ لوگ رحم دل اور شریف تھے۔ بچوں سے پیار کرتے تھے اور اکثر اپنے غلاموں سے بھی انصاف کے بجائے شفقت کا سلوک کرتے تھے مدت سے وہ شہر کی خاطر لڑ رہے تھے اور

ب ہو چے ہو کر شہر کے خلاف صف آزما ہو گئے تھے اور خود اپنی اور اپنے بچوں
کی حفاظت کر رہے تھے۔ معقولیت، عدل اور افراد کی عزت جس کے لئے ایتھنز
مشہور تھا، یہ اسے ختم کر دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اب مسئلہ چھ آدمیوں
کی زندگی اور موت کا نہ تھا بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہم تھا۔

سقراط نے ارسٹو جی نیز پر جھک کر کہا ''میں اس مسئلہ پر ووٹ لینے کی
مخالفت کروں گا کیا تم میرا ساتھ دو گے۔ جب تک ہم انکار کرتے رہیں گے وہ
اسے شماری نہیں کرا سکیں گے۔''

خوف سے ارسٹو جی نیز کا رنگ سفید پڑ گیا۔ وہ خود یہی سوچ رہا تھا
لیکن یہ بات اس کی ہمت سے بالاتر تھی۔ ''سقراط! تم سودائی ہو گئے ہو؟ کمان
دار تو مریں گے۔ اگر تم نے دخل اندازی کی تم بھی مرو گے۔''

سقراط نے آہستہ سے جواب دیا'' مجھے کمان داروں کی اتنی پروا نہیں
ہے۔ میں لوگوں کے چہرے دیکھ رہا ہوں۔ ان میں سے زیادہ تر سودائی ہو گئے
ہیں اور جو باقی ہیں وہ خوف زدہ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ سب ایک دن مریں
گے لیکن اس بات کو تو روکنا ہی ہے۔ کم از کم ہمیں تو اپنا حلف یاد رکھنا چاہیے کہ
ہم آئین کا احترام کریں گے تم میرا ساتھ دو گے کہ نہیں؟''

''میں کوئی ہیرو نہیں ہوں'' ارسٹو جی نیز نے جواب دیا۔ '' مجھے اپنے
بیوی بچوں کا بھی خیال ہے۔''

لیکن جب سقراط کھڑا ہوا تو ارسٹو جی نیز بھی اس کے ساتھ کھڑا ہو
گیا۔

یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ جب سقراط نے احتجاج کیا تو صدروں کی ایک چھوٹی سی جماعت نے اس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ وہ جان گئے کہ اس کا حشر کیا ہوگا۔ وہ کمان داروں کے دوست کا حشر دیکھ چکے تھے۔ جس نے اس سے پہلے کلیکو نیوس پر الزام لگانے کی کوشش کی تھی۔ پھر بھی وہ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے رائے شماری کروانے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد مجمع کا زور بہت بڑھ گیا ہوگا۔ کیونکہ ایک ایک کر کے بہادر اور ایمان دار آدمیوں نے مخالفت ترک کر دی۔ سقراط اکیلا رہ گیا تھا۔ وہ اصرار کرتا رہا کہ اس نے قانون کی پابندی کرنے کا حلف اٹھایا ہے اور وہ قانون کی پابندی کرے گا۔ اس کے کہنے کا مقصد تو پہلے ہی واضح ہو گیا ہوگا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اس پر اڑا رہے گا۔ اس کے باوجود وہ رات کو حسب معمول زندہ صحیح سالم اور ایک آزاد شہری کی طرح اپنے گھر زان ٹیپی کے پاس پہنچ گیا۔

اس کے احتجاج کے باوجود مسئلہ پیش کر دیا گیا۔ رائے شماری ہوئی۔ تھیرا منیز اور کلیکو نیوس جو چاہتے تھے وہی ہوا۔ کمان داروں کو موت کی سزا مل گئی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس جلسہ میں کوئی انوکھی بات ضرور ہوئی تبھی تو سقراط زندہ بچ کے واپس آ گیا۔ حالانکہ لوگ سمجھتے تھے کہ اس کے زندہ بچنے کا کوئی امکان نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک لمحہ کے لئے وہ خواب پریشان سی کیفیت ختم ہو گئی۔ ایک لمحہ کے لئے مجمع پھر معقولیت کی طرف مائل ہو گیا اور یہ ایک حقیقت ہے کہ بہت جلد ایتھنز کے لوگوں کو اپنے کیے پر نادم ہونا پڑا۔ انہوں نے کلیکو نیوس کو سزا دی۔ حالانکہ حقیقت میں ملزم وہ تھے۔ لیکن اس میں کوئی

شک نہیں کہ سقراط کی بات نے اثر کیا تھا اور اس کے بہت دنوں تک ایتھنز کے لوگ شاید صرف چند لوگ اور سقراط کے لئے تو ایک ہی کافی تھا۔ جو کچھ انہوں نے اس دن دیکھا ہوگا۔ اسے یاد کرتے رہے اور اس کی داستان اپنے بچوں کو سناتے رہے۔

دوسرا قصہ بہت مختصر ہے۔ ایتھنز کی شکست اور اس کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد جب لڑائی ختم ہو گئی تو اسپارٹا کے کمان دار نے تھرامنیز کو شہر میں آمریت قائم کرنے میں مدد دی۔ تھیرامنیز اور اس کے انتیس ساتھی نے جو مل کر تمیں ہو جاتے تھے مجلس کی جگہ حکمران ہو گئے۔ یہ لوگ تو اسپارٹا کے دوست تھے یا کم از کم جمہوریت کے مخالف ضرور تھے۔ جب یہ بات عیاں ہو گئی کہ ان کی پولیس، جسے لوگ تازیانہ زن کہتے تھے، مخالفت کو دبانے میں ناکام رہی ہے تو کمان دار نے ان کو چھ سو اسپارٹن سپاہیوں کا ایک محافظ دستہ دے دیا۔ جس کی چھاؤنی اکروپولس پر قائم کی گئی تاکہ وہ ان کے احکامات کی پابندی کرائے۔

اسپارٹا کے سپاہی "تمیں" کی تباہی کا باعث ہوئے۔ اول یوں کہ ہر شخص ان سے نفرت کرتا تھا۔ دوم یوں کہ ان کو تنخواہ دینی پڑتی تھی۔ "تمیں" کے لئے روپیہ اکٹھا کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ تھا کہ وہ روپیہ دوسروں سے چھین لیں۔ اس طرح وہ بد سے بدتر ہوتے گئے۔ پہلے انہوں نے اپنے سیاسی دشمنوں کو ہلاک کیا۔ اس کے بعد ان لوگوں کو مارا جو ان کے سیاسی دشمن ہو سکتے تھے اور آخر میں ان لوگوں کو مارا جن کا سیاست سے کوئی تعلق تو نہ تھا لیکن جو دولت مند تھے ان کی عادت تھی کہ ان کی گرفتاریوں میں وہ ایمان دار آدمیوں کو

اپنے ساتھ شریک ہونے پر مجبور کرتے تھے تاکہ جرم میں وہ بھی شریک ہو جائیں اور بعد میں "تیس" کی مدد کرنے پر مجبور ہوں۔ ان "تیس" کا آخرکار زوال ہوا اور جمہوریت بحال ہوگئی۔ لیکن اس وقت تک سینکڑوں بے گناہ قتل ہو گئے اور ان سے کہیں زیادہ لوگ قاتل بنا دیئے گئے۔

جس وقت دہشت اپنے عروج پر تھی سقراط کو چار دوسرے آدمیوں کے ساتھ "تیس" کے سامنے پیش کیا گیا اور انہیں کسی کو گرفتار کرنے کا حکم دیا گیا۔ "تیس" حسب معمول ایوان شہر میں مجلس گاہ سے ملحق اپنے دفتروں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجلس کو برقرار رکھا تھا۔ اس میں اب انہوں نے اپنے آدمی بھر رکھے تھے اور مجلس کے ارکان ماخوذ افراد کے خلاف مقدمات کی سماعت کرتے تھے۔ مقدمے کی کارروائی کے وقت وہ لوگ خود بھی موجود رہتے تھے تاکہ کوئی بدلی نہ ہونے پائے۔ سقراط کو ایک بار پہلے بھی "تیس" کے سامنے پیش کیا جا چکا تھا اور اس سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنی "تعلیم" بند کر دے۔ اس حکم کی سقراط نے اطاعت نہیں کی۔ اس لئے اس مرتبہ جب اس کے پاس عدالت میں پیشی کا بلاوا آیا تو اسے یقین نہیں تھا کہ وہ شام کو گھر واپس آئے گا۔

"تیس" کے کچھ آدمیوں سے سقراط بخوبی واقف تھا۔ تھیرامینیز کو وہ بحری کمانداروں کے مقدمہ کے وقت سے جانتا تھا۔ افلاطون کے ماموں قریطیاس سے بھی وہ بخوبی واقف تھا۔ آمریت کا تشدد جیسے تیز ہوتا جاتا تھا، اس کی قیادت تھیرامینیز کے ہاتھوں سے نکل کر قریطیاس کے ہاتھ میں آتی جا رہی تھی۔ برسوں پہلے کچھ عرصے تک قریطیاس بھی سقراط کے حلقہ میں شامل رہا

تھا۔ وہ دراصل سقراط کی قوت مناظرہ سے مرعوب ہوا تھا، اس کے خیالات سے نہیں۔ سقراط کو خوشی تھی کہ افلاطون ان میں نہیں تھا۔ افلاطون کا چچا کارمیڈیز قریطیاس کے ساتھ شامل ہو گیا تھا لیکن افلاطون نے انکار کر دیا تھا۔

سقراط اور دوسرے چار آدمیوں کو ''تیس'' سے جو احکام ملے تھے ایسے ہی احکام ان سے پہلے بھی مجبور لوگوں کو مل چکے تھے۔ احکام یہ تھے کہ وہ لوگ ساحل پر جائیں۔ سمندر پار کریں اور سلامیز کے جزیرہ میں پہنچ کر غدار لیان کو گرفتار کر کے مجلس کے سامنے مقدمہ کے لئے پیش کریں۔ ''تیس'' نے اس کا اقرار نہیں کیا تھا لیکن حقیقت تھی کہ لیان بہت ہی دولت مند آدمی تھا اور یہ بات ہر شخص کو معلوم تھی کہ وہ مجرم قرار پا جائے گا اور اسے ہلاک کر دیا جائے گا اور ایسے ہوا بھی۔ دوسرے چار آدمی تو حکم کے مطابق گئے اور لیان کو گرفتار کر کے ''تیس'' کے سامنے حاضر ہو گئے لیکن سقراط اپنے گھر چلا گیا۔

سقراط سے ان چاروں کے ساتھ کہہ دیا گیا تھا کہ اگر اس نے احکام نہ مانے تو پھر اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا حشر کیا ہو گا۔ لہٰذا گھنٹوں اس کے زن ٹیپی اور بچوں کے کان دروازے پر لگے رہے کہ کب اسپارٹا کے سوار اس کے دروازے پر دستک دیتے ہیں۔ معلوم نہیں کیا وجہ ہوئی کہ کوئی آیا نہیں۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد تھیرامینیز نے پورے ایتھنز کو حیرت میں ڈال دیا جب اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر پھانسیاں روک دیں۔

سقراط کے دوست زناخون کو جس نے اس دور کی تاریخ لکھی ہے یقین ہے کہ آخر میں تھیرامینیز جب مجلس کے سامنے مدافعت کرنے کے لئے

کھڑا ہوا تو اس کے ذہن میں لیان کے واقعہ کے خدوخال تازہ تھے۔ تھیرامینز
کا کام ہوا۔ قریطیاس نے اسے مار ڈالا اور دہشت اس وقت تک جاری رہی
یہاں تک کہ جو جمہوریت پسند جلاوطن کر دیئے گئے تھے وہ لڑتے بھڑتے پھر
اپنے وطن لوٹ آئے۔

بہرحال یہ تو طے ہے کہ پھر کوئی عجیب و غریب بات ہوئی تھی او
سقراط کا بال بیکا نہیں ہوا تھا۔

سقراط عدالت میں

یہ ۹۴ویں اولمپیڈ کا پہلا سال تھا۔ اسی سال کو ہم تین سو ننانوے قبل مسیح بھی کہہ سکتے ہیں۔ سقراط اب ستر برس کا ہو چکا تھا۔ اس نے فارقلیس کا زمانہ دیکھا تھا اسپارٹا سے خوفناک جنگ دیکھی تھی۔ انقلاب اور آمریت کے دوروں سے گزرا تھا اور اب بحال شدہ جمہوریت کے ابتدائی پرامن سالوں میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ ۳۹۹ قبل مسیح میں اگر کوئی شخص ایتھنز میں جاتا تو بظاہر اسے گذشتہ جنگ کے آثار کم نظر آتے۔ امن کے چار برسوں میں خوراک کی کثرت اور مال کی فروانی سے لوگوں کے چہروں پر رونق آ گئی تھی۔ پائیریوس میں جو کوبہ کو جنگ ہوئی تھی اور جس کے نتیجے کے طور پر جلاوطن جمہوریت پسند پھر وطن واپس لوٹ آئے تھے۔ اس جنگ کے زخم امن کے چار سالوں نے بھر دیئے تھے۔ دو سال ہوئے "تمیں" کے آخری مضبوط قلعہ نے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور ایتھنز میں ایک بار پھر جمہوریت کا دور دورہ تھا۔ جیوری کے ارکان مقرر کر دیئے گئے تھے۔ ایوان اعلےٰ قائم ہو چکا تھا اور تمام شہریوں نے امن قائم رکھنے اور گزری ہوئی باتوں کو بھول جانے کا حلف اٹھایا تھا۔ افلاطون اب اٹھائیس سال کا ہو چکا تھا چونکہ اسے اپنی زندگی کسی اچھے کام کے لئے وقف کر

دینے کی خواہش تھی۔ لہٰذا وہ بہت سنجیدگی سے میدان سیاست میں داخل ہونے کے مسئلہ پر غور کر رہا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شہر میں ہجوم کی حکومت اور تشدد کا دور ختم ہو گیا ہے اور اب یہاں مہذب لوگ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگ خانہ جنگی کو بھولے نہیں تھے۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ پھر جنگ سے پہلے کے حالات پیدا ہو جائیں۔ لیکن یہ ناممکن تھا۔ خاندان تتر بتر ہو گئے تھے۔ بہت سے لوگ اپنی جائداد واپس مانگتے تھے۔ جن کے بھائی یا بیٹے مارے گئے تھے وہ قصاص چاہتے تھے۔ تلخیاں اور زہرناکیاں زندگی میں سرایت کر چکی تھیں۔ شہر کا آدھا حصہ ''تمیں'' کے جرم کا شریک تھا۔ باقی آدھے حصے نے جلاوطنی کے مصائب اور مالی نقصانات برداشت کئے تھے۔ ظاہر تھا اگر یہ دونوں ایک ساتھ مل کر نہ رہ سکے تو شہر مٹ جائے گا۔

مختصر یہ کہ لوگوں کی خواہشات تو بہت تھیں لیکن ان کے خوف اور اندیشے بھی زیادہ تھے۔ سب سے زیادہ خائف وہ کسی ایسی چیز سے تھے جس سے امن کے درہم برہم ہونے کا خطرہ ہو۔ ایمان دار قدامت پسند محبان وطن جو جمہوریت کی بحالی کے ابتدائی سالوں میں شہر کے رہنما تھے۔ اس معاملہ میں شہریوں کی اکثریت کے ہمنوا تھے۔ وہ امن کے لئے کوشاں رہتے۔ وہ اسپارٹا والوں سے نرمی سے بات کرتے انہوں نے بڑے صبر و تحمل سے ایتھنز کے سیاسی نقصانات کو برداشت کیا۔ (کہ مقبوضات ہاتھ سے نکل گئی تھیں) اور انقلاب کے زمانہ کا اسپارٹا کا جو قرض ان پر باقی تھا اسے خزانہ میں روپے کی کمی کے باوجود ادا کر دیا۔ امن کو برقرار رکھنے کے لئے وہ اپنے ذاتی مفاد بھی قربان

کر دیتے تھے۔ ان میں سے ایک محب وطن انیطوس کی سارے شہر میں اس بات پر تعریف کی جا رہی تھی کہ اس نے اپنی جائداد لینے سے انکار کر دیا تھا جو اس کے جلاوطنی کے زمانہ میں فروخت کر ڈالی گئی تھی۔

دوسروں سے بھی قربانیاں طلب کی جاتی تھیں۔ پہلا شہری جس نے گذشتہ شکایات کے بھول جانے کا حلف توڑا، اسے کونسل (مجلس) نے موت کی سزا دی اور اسے فوراً ہلاک کر دیا گیا۔ بہت سے لوگوں نے اس فیصلے کو پسند نہیں کیا۔ کیونکہ موت کا حکم دینے کا اختیار صرف عدالتوں اور ایوان ہی کو تھا۔ لہذا دوبارہ ایسا کوئی واقعہ پیش آنے نہیں دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوا کا رخ کدھر تھا۔ ارسٹوفینیز اور دوسرے مزاحیہ شاعر جو سقراط کے دوست بھی تھے اور نکتہ چیں بھی اور معاصرانہ سیاست اور سیاست دانوں کا مضحکہ اڑایا کرتے تھے۔ اب انہیں دوسرے موضوع تلاش کرنے پڑے جن کا ذکر کرنا خطرے سے خالی ہو۔ ایتھنز میں ان دونوں نکتہ چینی مقبول نہیں ہو رہی تھی کہ لوگ اسے حب الوطنی کے خلاف سمجھتے تھے۔

سقراط بہرحال اپنا کام کرتا رہا۔ وہ ہمیشہ سے اس بات کا خواہش مند تھا کہ شہر میں قانون کا دور دورہ رہے۔ وہ خود بھی قانون کی پابندی کرتا تھا لیکن ظاہری امن کے لئے لوگوں کی زبان بند کرنے کا وہ کبھی قائل نہ ہوا تھا۔ برسوں کی محنت کے بعد وہ اس قابل ہوا تھا کہ لوگوں کے ذہن میں نیکی کی صداقت کا جو شعور مخفی تھا اسے دیکھ سکے۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کے باپ نے ایک بار پتھر کے نیچے شیر کا سر دیکھا تھا۔ ایک اچھے سنگ تراش کی طرح اس کی عادت تھی

کہ سچ کے نقاب کو ہٹا دیتا تھا تاکہ اس کا اندرونی حسن اور حقیقت نمایاں ہو جائے۔ ابتدا میں لوگ اس روش سے گھبراتے تھے لیکن وہ اس بات کا عادی ہو گیا تھا۔ "سچ" تمام لوگوں کی مشترک میراث تھا اور ایک بار لوگ اسے دیکھ لیتے تو گویا امن و امان خود بخود قائم ہو جاتا۔ اسی لئے اس نے "سچ" کی جستجو جاری رکھی۔

شاید سقراط آنے والے خطرات کو نہیں دیکھ سکا۔ اگر وہ دیکھ بھی لیتا تو انہیں کچھ اہمیت نہ دیتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کراسٹو کو بھی کوئی شبہ نہیں ہوا۔ وہ اور سقراط کتنی ہی بار تشدد کے دور گزار چکے تھے اور اب تو ایتھنز میں سکون تھا اور قانون کی حکمرانی تھی اور ایک دن لوگوں میں سرگوشیاں شروع ہوئیں جو بعد میں ایک خبر بن گئیں اور تھوڑی دیر میں یہ خبر سارے شہر میں گشت کر رہی تھی۔ سقراط عدالت میں طلب کیا گیا تاکہ اس امر پر مقدمہ چلایا جائے اور اسے موت کی سزا دی جائے۔ حقیقت یہ تھی کہ سقراط پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ ان دیوتاؤں کو نہیں مانتا جن کا شہر معتقد تھا۔ کہا جاتا تھا کہ نئے دیوتاؤں پر ایمان لے آیا ہے اور نوجوانوں کو گمراہ کر رہا ہے۔ حقیقت میں اس الزام کے کوئی معنی نہیں تھے لیکن اگر کوئی چالاک مقرر چاہتا تو الفاظ کو توڑ مروڑ کر انہیں جو معنی چاہتا پہنا دیتا۔ اس مقدمہ میں مائیلی توس مستغیث تھا۔ یہ ایک جوان آدمی تھا جسے اکثر لوگ جانتے بھی نہ تھے۔ حالانکہ اسی سال یہی شخص ایک اور شخص کو الحاد کے الزام میں سزا دلا چکا تھا۔ عدالت میں اس کی مدد کے لئے دو بارسوخ آدمی بھی چنے گئے تھے ایک لائی کون مشہور مقرر اور دوسرا مشہور سیاست دان انیطوس جس کے متعلق سب

جاتے تھے کہ محب وطن بھی ہے اور دیانت دار بھی۔ اس کا نام مستغیثوں
شامل ہونے کے بعد سقراط کے بری ہو جانے کے امکانات بہت کم ہو گئے
مہینے کے اندر اندر جیوری کے ۵۰۱ اراکین کو مقدمے کی سماعت کرنا تھی
بات کسی کو مقدمہ کے دن تک نہیں معلوم تھی کہ جیوری میں کون کون
ں ہوگا۔ مقدمہ عدالت میں پہنچ جانے کے بعد ایک ہی دن میں فیصلہ صادر
ر دیا جاتا تھا۔ ایک رکن کی رائے کے ادھر یا ادھر ہونے سے سقراط کو جلاوطنی یا
موت کی سزا دی جا سکتی تھی (سزا کا انحصار عدالت کی صوابدید پر تھا) مائیلی توس
بہر حال عدالت سے بھی درخواست کرنا تھی کہ سقراط کو موت کی سزا دی
جائے۔ سقراط کے پاس پانی کی گھڑی کے اوقات کے مطابق صرف ایک دن
تھا۔ ایک دن سے بھی کم، بلکہ صرف چند گھنٹے جس میں اسے کم از کم دو سو اکیاون
شہریوں کو یقین دلانا تھا کہ اس کی تمام زندگی پارسائی میں گزری ہے۔

ایتھنز میں جب کوئی مقدمہ شروع ہوتا تھا تو خوب گپ رہتی تھی۔ ذرا
فرض کر لیجیے کہ آپ ایتھنز میں ہیں۔ سقراط تو موجود نہیں لیکن بازار میں
باتیں اس کے متعلق ہو رہی ہیں۔ مثلاً مچھلی بازار کے تختوں کے قریب کچھ اس
طرح کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ”معلوم نہیں تمہاری رائے کیا ہے؟ لیکن بھئی میں تو
برسوں سے ایسی ویسی بات کا منتظر تھا۔ ملیطوس بالکل ٹھیک کہتا ہے۔ کوئی شہری یہ
نہیں برداشت کر سکتا کہ نوجوان اپنے والدین پر اعتراض کریں۔ کریٹیاس اور
اس کے ساتھیوں نے بعد میں بلوہ مچایا۔ ہمیں تو ایلسی بیاڈیز پر جو بیتی تھی اس
سے سبق حاصل کرنا چاہیے تھا۔ ”یہ شخص سقراط بہت خطرناک ہے۔ اسپارٹا میں تو

اسے وہ بخشتے بھی زندہ نہ رہنے دیا جاتا۔"

ایک قصاب کی دوکان پر گفتگو کا رنگ یہ ہے۔ "نہیں میں اس وقت وہاں موجود نہیں تھا لیکن لوگ کہتے ہیں کہ سارا فساد اینطوس کے لڑکے سے شروع ہوا ہے۔ وہ اپنے باپ کے چمڑے کے کاروبار میں شریک نہیں ہونا چاہتا تھا اور میرا خیال ہے کہ سقراط نے یہ بات اینطوس کو بتا دی (اور لڑکے کی طرفداری بھی ضرور کی ہوگی) اس پر باپ کو طبعاً سخت تاؤ آیا اور اس نے کہا کہ میں جانوں میرا لڑکا جانے، تم کون ہوتے ہو، میرے لڑکے کو میرے حکم کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔ بہرحال لڑکے نے اس واقعے کے بعد شراب پینا شروع کر دیا ہے اور اینطوس کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ سقراط کا کیا دھرا ہے۔ تم پوچھتے ہو میرا خیال کیا ہے؟ بھئی میرا خیال تو یہ ہے کہ اینطوس ممکن ہے بہت بڑا سیاست دان ہو۔ (آخر سب لوگ یہی کہتے ہیں) لیکن شکر ہے کہ وہ میرا باپ نہیں ہے۔"

اور ساہوکاروں کی رمزوں کے قریب لوگ اس طرح کی باتیں کر رہے تھے "کیوں بھئی کیا یہ سچ ہے کہ جھگڑا بہت پرانا ہے۔ ایلسی بیادیز کے وقت کا۔"

اور تیل کی دوکان پر گفتگو کا رنگ یہ ہے۔ "وہ ستر برس کا بوڑھا ہے۔ بیوی ہے، تین بچے ہیں۔ ان لوگوں کو چاہیے تھا کہ بڈھے کو امن سے رہنے دیتے۔ یوں میں بھی اس سے ایک مرتبہ بات چیت کر چکا ہوں۔ وہ ٹھیک اسی جگہ کھڑا تھا جہاں تم اس وقت کھڑے ہو۔ وہ بہت معمولی باتیں کر رہا تھا۔

بچوں کی طرح وہ بڑے بڑے لفظ استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس دن ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ سچ پوچھو تو وقت تو ہمیں ملتا ہی نہیں لیکن مقدمہ کے دن میں ضرور جاؤں گا۔ خواہ مجھ کو اپنی دوکان ہی بند کرنی پڑے۔"

اور ذیوس کے برآمدے میں ٹہلتے ہوئے لوگوں کی بات چیت کی شکل یہ ہے اب کیا کرنا چاہیے؟ تمہیں معلوم ہی ہے کہ جب ہم نے جیوری کو متاثر کرنے کے لئے زن ٹیپی اور بچوں کے لئے ماتمی لباس پہننے کا مشورہ دیا تو اس کا رد یہ کیا تھا۔ وہ تو معمولی احتیاط سے بھی کام نہیں لیتا اور پھر ایک معقول تقریر کی تیاری کا مسئلہ درپیش ہے۔ شاید یہ تو اس نے ٹھیک ہی کیا کہ اس نے لسیسیس کی لکھی ہوئی تقریر کو یاد کرنے سے انکار کر دیا ہے لیکن میں نے اسے خود تقریر تیار کرتے ہوئے بھی تو نہیں دیکھا۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ دیکھنا حسب معمول آجکل اور یہ سوں مقدمہ کی تاریخ تک روزانہ دوپہر کے بعد ورزش گاہ پہنچا کرے گا۔ وہ ان نوجوانوں کی خاطر اپنی جان دے رہا ہے جن کی پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں۔ کرائٹو ہم میں سے کوئی بھی اس بات کا سزاوار نہیں کہ سقراط ہماری خاطر تکلیف اٹھائے۔ کیا کریں کرائٹو۔"

اور محب وطن انطوس کے مکان پر یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ "لائی کون سنو اس مقدمہ میں ہمیں کوئی غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ مقدمہ کو غارت کر کے اور اس آدمی کو ہیرو بنانے کے بجائے تو یہی اچھا ہے کہ اسے چھیڑا ہی نہ جائے۔ مائیلی توس پر زیادہ بھروسہ نہ کرو اگر سقراط نے اس پر جرح شروع کر دی تو منٹوں میں اس کے بخیئے ادھیڑ کے رکھ دے گا۔"

''لیکن اینطوس! ان مقدمات میں جرح کی اجازت ہوتی ہے! بات خلاف قاعدہ معلوم ہوتی ہے۔''

''ممکن ہے لیکن سقراط کا یہی طریقہ ہے اور وہ اسی پر کاربند رہے گا۔ تمہیں نہیں معلوم کہ وہ کتنا ضدی ہے۔ لیکن یہی بات اس کے خلاف جائے گی۔ شرط یہ ہے کہ ہم اپنا کام بخوبی انجام دے لیں۔ اسے یہ کہہ کر ذرا تاؤ دلاؤ کہ ہماری جمہوریت میں اکثریت کے فیصلے ہی نافذ ہوتے ہیں اور دانشمندانہ بھی اور اگر اکثریت ہی یہ فیصلہ صادر کردے کہ سقراط کی تعلیمات گمراہ کن ہیں تو سقراط بھی اس فیصلے کا پابند ہوگا اور ہاں لائی کون میں تمہیں ایک بات یاد دلانا چاہتا تھا۔ ایلسی بیاڈیز یا قریطیاس کا نام نہ لینا نہ کوئی ایسا الزام لگانا جو''تمیں'' کے زوال سے پہلے کے زمانے سے متعلق ہو۔ تم جانتے ہو کہ ایسا کرنا خلاف قانون ہے۔''

''لیکن ایلسی بیاڈیز اور قریطیاس والے واقعات ہی پر تو مقدمات کا انحصار ہے اینطوس تمہارا یہ مطلب ہے کہ ہم ان سے ....''

''مجھے افسوس سے یہ بات کہنا پڑتی ہے لائی کون کہ اس معاملے میں تو میں تمہاری بات نہیں سنوں گا اور اپنی بات پر اصرار کروں گا۔ الزام لگانے کے بجائے رمز و کنایہ میں بات کرو لیکن قانون شکنی نہ کرو۔ کیونکہ اس قانون کے ذریعہ کچھ سالوں تک ہم شہر میں اتحاد قائم رکھ سکتے ہیں۔ ایک شخص جو شہر کے امن کو تباہ کر رہا ہے اگر ہم اس کے خلاف صف آرا ہوئے ہیں تو اس کے یہ معنی تو نہیں کہ ہم خود اپنے آپ کو بھی تباہ کر لیں۔ اسے اپنے گھمنڈ کا شکار ہونے دو

اور اس کے علاوہ تم بازار میں لوگوں کی باتیں بھی سن چکے ہو۔ لوگوں نے ایسی بیہودہ چیز کے متعلق سوچنا شروع کر دیا ہے انہیں یہ بات یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

چنانچہ ایتھنز کے بھلے مانس شہری اپنی مرضی کے مطابق کام کر رہے تھے۔ سقراط کے دوست خوفزدہ تھے، لیکن پرامید بھی تھے۔ کچھ لوگ حیران تھے کہ کیا ہو گا۔ سقراط کے دشمن اس کے خلاف منصوبے بنا رہے تھے۔ لیکن بہت کم آدمی ایسے ہوں گے جن کی سمجھ میں آتا ہو کہ آخر ہو کیا رہا ہے۔ ابتدائی پیشی کے بعد سقراط حسب معمول ورزش گاہ کو چلا گیا۔ جب کسی نے اس سے پوچھا کہ تم اپنے مقدمہ کی تقریر کب تیار کرو گے تو اس نے جواب دیا کہ میں تمام عمر اسی کی تیاری کرتا رہا ہوں۔ اس کے بعد کوئی شخص کیا کہہ سکتا تھا۔

مقدمہ کی صبح بھی آخر آ ہی گئی۔ کرائٹو، اس کا لڑکا بولس، افلاطون اور بقیہ لوگ سویرے ہی سقراط کے گھر عدالت جانے کے لئے آ گئے۔ انہوں نے حسب معمول اسے خوش وخرم پایا۔ زن تھپی نے جس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ رات جاگتی رہی ہے کہا کہ سقراط رات خوب سویا۔ کچھ باتیں ہوئیں۔ پھر مذاق کرنے کی کوشش کی گئی تو اس میں وہ اپنے دوستوں کے مقابلہ میں زیادہ تیز ثابت ہوا۔ کرائٹو نے دیکھا کہ وہ جس وقت اپنے گھر سے نکلا تو راستے میں تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ جیسے وہ کسی ایسی آواز کو سننے کی کوشش کر رہا ہو جو اسے سنائی نہ دے رہی ہو۔ اس کے بعد وہ مسکرایا۔ جو لوگ سقراط کی اس مسکراہٹ کے دلدادہ تھے جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں اور بھی روشن اور کشادہ

نظر آئی تھیں آج اسے مسکراتے دیکھ کر آزردہ خاطر ہوئے۔ وہ عدالت میں اس کے ساتھ گئے۔

ایتھنز کے پانچ سو ایک شہری جو قرعہ اندازی کے ذریعے جیوری کے لیے منتخب ہوئے تھے عدالت میں آنے شروع ہو گئے۔ وہ اپنے دن بھر کے معاوضہ کی سند لے کر آگے بڑھ رہے تھے تاکہ اچھی جگہ مل جائے۔ صدر عدالت شاہ آرکن اپنے تخت پر بیٹھا ہوا تھا اور تماشائی جن میں بعض بے چین تھے اور بعض محض شوقیہ آئے تھے، کھچا کھچ جیوری کے حصے تک بھرے ہوئے تھے۔

کارروائی حسب معمول دعا سے شروع ہوئی اور شاہ آرکن نے رسمی طور پر مقدمہ کی سماعت کے آغاز کا اعلان کیا۔ اس کے بعد نقیب نے ملزم اور مستغیث کو عدالت میں پیش ہونے کے لئے پکارا۔ کریٹو نے کہا "سقراط اپنے دوستوں کی خاطر جرم کر مقدمہ کرو۔" اسے اس بات پر ندامت محسوس ہو رہی تھی، خوف اس بات پر آ رہا تھا کہ سقراط کو کچھ ہو گیا تو مجھے کتنا نقصان پہنچے گا۔

مستغیث پہلے بولے۔ شاید اپنے اعتقاد اور معیار کے مطابق وہ ایمانداری سے بولے لیکن وہ سچ نہیں بولے۔ سقراط اپنی جگہ پر بیٹھا اپنی باری کا منتظر تھا۔ جو کچھ کہا جا رہا تھا اس سے وہ ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔ وہ لوگ کسی اور آدمی کی باتیں کر رہے تھے۔ ایک ایسا آدمی جسے بدامنی پسند تھی۔ ایک ایسا آدمی جس کی اپنی کوئی اساس نہیں تھی اور وہ دوسروں کی اساس کو تباہ کر رہا تھا۔ کیا جو کچھ وہ کہہ رہے تھے اسے وہ سچ سمجھتے تھے۔

سقراط نے لفظ تو سنے ہی لیکن لفظوں کے پیچھے جو خوف کارفرما تھا اس

تصور بھی اسے ہوا۔ اب وہ بہت سی باتوں پر غور کرنے لگا اور جو باتیں اب
تک لیکن اس کی سمجھ میں آئی تھیں وہ ان سے بخوبی آگاہ ہو گیا۔ اگر اس سے
پہلے نہیں تو کم از کم اس وقت اس کی سمجھ میں یہ بات ضرور آ گئی کہ اس مقدمہ کا
اصل مقصد کیا تھا۔

یہ حقیقت بہت اہم تھی کہ یہ لوگ خوفزدہ تھے اور یہ بھی کہ کیوں خوفزدہ
تھے۔ وہ نیکی سے خوف زدہ تھے وہ برے آدمی نہیں تھے لیکن وہ زندگی جس پر
سقراط عمل پیرا تھا ان کے لئے ناقابل برداشت تھی اور اس زندگی کی ہیچ قدریں
انہیں ناگوار تھیں۔ ان کو اپنی چھوٹی چھوٹی نیکیوں سے محبت تھی۔ حفاظت آرام
اور مانوس طریقے اور انہیں ڈر تھا کہ کہیں وہ ان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔ سقراط
ان بے چارے نادانوں کو بتانا چاہتا تھا کہ نیکی کو، جلیل القدر نیکی کو بہرحال
چھوٹی چھوٹی نیکیوں پر تفوق حاصل ہے۔ یہی نیکی تمام اچھائیوں کا سرچشمہ
ہے۔ سقراط سوچ رہا تھا کہ اگر ان دونوں میں سے کسی کو اختیار کرنے کا مرحلہ
آن لگا تھا تو آج اس کا فیصلہ ہو جانا چاہیے تھا۔ اسی لئے دیوتا نے مجھے اس جگہ
پر کھڑا کیا ہے۔ آج عدالت میں انطوس سقراط کے خلاف صف آرا نہیں تھا بلکہ
اصول اور وہ ایمان جو عقل پر مبنی ہوتا ہے، نادان قدامت پسندی اور خوف کے
ساتھ صف آرا تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ انطوس، مائیلی توس، لائیکون، جیوری کے
ارکان اور ایتھنز کے شہری کیا کرتے ہیں اور اب خدا کا یہی منشا ہے تو پہلے میں
ہی اس بات کا فیصلہ کرتا ہوں کہ کس چیز کو ترجیح دی جائے گی اور یہی سوچ کر وہ
بولنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

سقراط نے کیا سوچا تھا۔ اس کا اندازہ تو ہم اس سے کر سکتے ہیں جو بعد میں اس نے کہا لیکن جو کچھ اس نے کہا وہ ہمارے سامنے ہے کیونکہ افلاطون عدالت میں ایک ایک لفظ سننے کو موجود تھا۔ اسے یاد بھی رکھنا چاہیے تھا کیونکہ اس دن اس نے جو کچھ سنا اور محسوس کیا اس سے اس کی تمام زندگی بدل گئی اور وہ بجائے سیاست دان کے فلسفی ہو گیا۔

افلاطون کے لئے مقدر تھا کہ وہ سقراط کی تقریر کو یاد رکھے اور بڑی احتیاط سے اسے نرسل کے پتوں پر لکھ لے (جو اس زمانہ میں کاغذ کے طور پر استعمال ہوتے تھے اور جنہیں پیپرس کہتے تھے) اور اغلب ہے کہ وہ لوگ ابھی زندہ تھے جنہوں نے سقراط کو بولتے سنا تھا اور انہیں اس کی تقریر یاد بھی تھی۔ اس تقریر کو آئندہ نسلوں نے معذرت معذرت کہہ کر پکارا کہ یونانی میں ملزم اپنی مدافعت میں جو تقریر کرتا تھا اسے معذرت ہی کہتے تھے اور اگر سقراط نے وہی کہا جو افلاطون نے لکھا ہے تو یہ ایک ایسی معذرت ہے جو عدالتوں میں شاید ہی کبھی سنی گئی ہو۔

معذرت

"ایتھنز کے لوگو!" سقراط نے ابتدا کی اور تمام عدالت میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ اس نے حسب معمول جیوری کے معزز ارکان کیوں نہیں کہا تھا۔ کیا یہ شخص اس بات کو بھول گیا ہے کہ اس وقت وہ عدالت کے روبرو جواب دہی کے لئے کھڑا ہے۔

"ایتھنز کے لوگو! میں نہیں جانتا کہ جس وقت مجھ پر الزام لگانے والے تقریریں کر رہے تھے اس وقت تم کیا محسوس کر رہے تھے۔ ان کی تقریریں بااثر تھیں۔ ان کی تقریریں سن کر میں تو تقریباً یہ بھول گیا تھا کہ میں کس طرح کا آدمی ہوں۔"

سقراط کے نزدیک ظاہر ہے کہ یہ سب مذاق تھا اور سقراط نے اس سے لطف اٹھایا۔ اس کے دوستوں نے اس سے پہلے اس کو کبھی اس قدر مطمئن نہیں دیکھا تھا۔

اس نے سامنے کی تقریر گاہ پر اینطوس، مائیلی توس اور لائیکون کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "پھر بھی حقیقت یہ ہے کہ سچ تو انہوں نے بالکل بولا ہی نہیں۔"

شاہ آرکن اپنی کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ منشی اور نقیب اپنی جگہوں پر تھے۔ وقت کا حساب رکھنے والوں نے پانی کی گھڑی چالو کر دی۔ ہر چیز باقاعدہ تھی۔ مقدمات کی کثرت کی بنا پر عدالت کو قریباً ہر روز ایک مقدمہ سننا پڑتا تھا اور ان لوگوں کا خیال تھا کہ یہ مقدمہ بھی دوسرے مقدموں کی طرح ہو گا۔ ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ سقراط کی سچائی کا طریقہ ہر چیز کو الٹ پلٹ کر دیتا ہے۔

پھر بھی سقراط کی تقریر میں بظاہر کوئی الٹ پلٹ کر دینے والی نہ تھی۔ اگر سقراط نے اسے پہلے سے مرتب نہیں کیا تھا تو اس وقت دیوتا اسے بہت ہی حسین اور مناسب طریقہ سے ترتیب دے رہا تھا۔ اس کی تقریر کے الفاظ اتنے سادہ تھے کہ ایک بچہ اور دانا دونوں اسے آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔

سقراط نے لوگوں سے کہا" اگر میں اپنی صفائی ایسے الفاظ میں پیش کروں جو تم نے بازار میں یا ساہوکار کی دکان پر (جہاں تم میں سے اکثر لوگوں نے مجھے باتیں کرتے سنا ہے)..... مجھ سے پہلے بھی سنے ہیں تو متعجب نہ ہونا اور نہ مجھے ٹوکنا۔ میری تقریر کرنے کے طریقے پر بھی دھیان نہ دینا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ طریقہ برا ہو اور ہو سکتا ہے کہ اچھا ہو۔ صرف ایک بات پر دھیان دینا کہ آیا جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ صحیح ہے یا نہیں۔ کیونکہ فیصلہ کرنے والے کی خوبی اس میں ہے کہ وہ اس پر دھیان دے کہ سچ کیا ہے۔ جس طرح ایک مقرر کی خوبی یہ ہے کہ وہ سچ بولے۔

سقراط کو اپنی تقریر میں بہت کچھ کہنا تھا اور وقت بہت کم رہ گیا تھا۔

پہلے تو سقراط کو زمین ہموار کرنی تھی۔ اسے پرانے تعصبات کو جڑ سے اکھاڑنا تھا۔ مثال کے طور پر ارسٹوفینیز کے ڈرامے کا پرانا مذاق اور افواہیں جن کی اگرچہ کوئی بنیاد نہیں تھی لیکن جو زیادہ خطرناک تھیں۔ اس عدالت میں کچھ لوگ تھے جن کا ابھی تک یہ خیال تھا کہ سقراط انکسا غورث کی طرح بے دین سائنس دان تھا۔ یہاں تک کہ مائیلی توس جو اس سے اچھی طرح واقف تھا وہ بھی اس پر دہریہ ہونے کا الزام لگانے کی کوشش کرتا تھا اور چاند اور سورج کے متعلق حیرت انگیز نظریوں کا حوالہ دیتا تھا۔ بہت سے لوگ سقراط کو سوفسطائی معلم سمجھتے تھے جو اپنے شاگردوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ جھوٹ کو سچ کر دکھائیں۔

''پھر اگر تم نہ سائنس دان ہو اور نہ سوفسطائی تو سقراط پھر تمہارا کام کیا ہے اور تم پر شک کیوں کیا جا رہا ہے؟''

اس کے جواب میں اسے کریٹن کے ہاتف غیبی والی پرانی کہانی دہرانا پڑی اور اس مقصد کا ذکر کرنا پڑا جو اس کہانی سے وابستہ تھا۔ پھر ماہرین سے سوال جواب اور پھر ان دانشوروں کا قصہ جنہوں نے بحث کے بعد محسوس کیا تھا کہ وہ نادان ہیں۔ اصل مشکل یہ تھی کہ سچ سے اضطراب پیدا ہوتا تھا۔ یہی بات پرانے تعصبات اور مائیلی توس کے نئے الزمات کی تہ میں پوشیدہ تھی۔ مائیلی توس ایک بے وقوف جاہل آدمی تھا۔ سقراط نے یہ بات ثابت کرنے کے لئے اس پر جرح کی لیکن اس کی بے وقوفی میں دوسرے آدمی بھی تو شریک تھے۔

''یہی وہ چیز ہے جو آخر میں مجھے تباہ کر دے گی۔ سقراط نے آہستگی سے کہا۔ ''اگر کوئی مجھے تباہ کرے گا تو وہ مائیلی توس یا انیطوس نہ ہوگا بلکہ مجھے دنیا

برباد کرے گی۔ جو میرے متعلق برا کہتی ہے اور مجھے برا سمجھتی ہے۔ اسی دنیا نے پہلے بھی دوسرے نیک آدمیوں کو برباد کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ آئندہ بھی کرتی رہے گی۔ اس بات کا کوئی خطرہ نہیں ہے کہ یہ قصہ مجھی تک ختم ہو جائے گا۔"

اس پر کچھ آوازیں بلند ہوئیں۔ ایک غضب ناک جیوری نے اپنے ساتھی سے کہا "دیکھو الٹا چور کوتوال کو ڈانٹ رہا ہے۔ یعنی اگر ہم پانچ سو ایک سب کے سب اسے مجرم قرار دیں اور وہ مجرم کی موت مرے، پھر بھی وہ نیک آدمی رہے گا کیوں؟ یہی باتیں جمہوریت میں نوجوانوں کو سکھائی جائیں گی۔ میں جانتا ہوں کہ میری رائے کیا ہوگی۔"

یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ آوازیں سقراط نے سنی ہوں یا نہ سنی ہوں۔ اس نے اپنی تقریر جاری رکھی لیکن آواز بلند کر دی تا کہ ہجوم کے شور میں دب کر نہ رہ جائے۔

"کچھ لوگ شاید یہ کہیں۔ سقراط تمھیں شرم نہیں آتی۔ تم نے ایک ایسا کام کیا ہے جس نے تم کو خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔"

"اگر مجھ سے کوئی سوال کرے گا تو میں اس کو ایمان داری سے جواب دوں گا۔ میں اس سے کہوں گا دوست اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ ایک شخص جو کسی قابل ہے اسے ہر وقت یہی دیکھتے رہنا چاہیے کہ اس کے مرنے اور جینے کے امکانات کیا ہیں تو تم غلطی پر ہو۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ ایکیلیز موت اور خطرات کی پرواہ کرتا تھا۔ نہیں۔ ایتھنز کے لوگو! سچائی کی روشنی میں دیکھو تو حقیقت یہ ہے اگر کوئی شخص اپنی بات پر قائم رہتا ہے خواہ اس لئے کہ خود اس نے طے کیا

ہے کہ اپنی بات پر قائم رہنا ہی مناسب ہے اور خواہ کسی حاکم نے اسے اس امر پر مامور کیا ہے دونوں صورتوں میں میرے خیال کے مطابق اسے ڈٹا رہنا چاہیے اور اسے اپنی بات کے لئے ہر خطرے کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ اسے اس بات کی پرواہ زیادہ کرنی چاہیے کہ ندامت نہ حاصل ہو موت کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔''

''ایتھنز کے لوگو! بحیثیت سپاہی کے میں اسی مقام پر کھڑا رہا جہاں میرے افسروں نے مجھے کھڑا رہنے کا حکم دیا تھا۔ ان افسروں کو تم نے مجھ پر حاکم بنایا تھا۔ پوٹیڈیا، ایمفیپولیس اور ڈیلی ام کی لڑائیوں میں میں بھی دوسروں کی طرح اپنی جگہ پر ڈٹا رہا اور موت سے کھیلتا رہا۔ لیکن جو کام میں اس وقت انجام دے رہا ہوں اس پر دیوتا نے مجھے مامور کیا ہے۔ یہ میرا خیال اور میرا عقیدہ ہے۔ دیوتا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنا اور دوسرں کا جائزہ لوں اور یوں فلسفہ کے لئے اپنی زندگی وقف کر دوں ایتھنز کے لوگو! اگر میں موت یا کسی دوسری چیز کے ڈر سے اپنے مقام پر ڈٹا نہ رہوں تو میرا یہ فعل نہایت برا ہوگا۔ اگر میں ایسی حرکت کروں تو یہ بات بہت ہی بے جا ہوگی اور تم کو حق ہوگا کہ تم مجھ پر دیوتاؤں پر ایمان نہ لانے کا الزام لگاؤ۔''

اس کے دوست جو اس سے محبت کرتے تھے انہوں نے بھی سقراط کو اس رنگ میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے وہ ٹھیک ہی تو کہتا تھا اور ہم اس کی باتیں نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اپنی تمام عمر اسی کے لئے تیاری کرتا رہا۔ ہم اس کو جیسا جانتے تھے وہ تو اس سے بھی عظیم ثابت ہوا۔

یہ نظارہ دیدنی تھا۔ یہاں تک کہ اینطوس کو بھی اس موقع کی عظمت کا شعور حاصل ہوا لیکن یہ بھی ہے کہ چھوٹے آدمیوں کے لئے اس عظمت سے دوچار ہونا بہت دشوار تھا۔ جوں جوں سقراط تقریر کرتا گیا اس کے دوستوں نے محسوس کیا کہ مخالفت کی ایک لہر ابھر رہی ہے۔ وہی مخالفت جو کسی زمانہ میں انہیں بھی سقراط سے تھی اور اس وقت تک باقی رہی جب تک وہ اس کے ہم خیال نہیں ہو گئے۔ یہ امر بڑا تکلیف دہ تھا کہ سقراط کا معیار اعلیٰ تھا اور وہ اپنے اقوال و اعمال کے ذریعہ گویا چھوٹے لوگوں کے افکار اور اعمال کو کسوٹی پر کس رہا تھا۔

سقراط آج بھی کام کر رہا تھا۔ اس کا اصل طریقہ تو یہ تھا۔ آہستہ آہستہ سوال جواب کے ذریعہ تصورات اور افکار کی توضیح کرے، کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو رک جائے۔ لیکن آج اس حالت میں ایسا کرنا ناممکن تھا۔ ہو سکتا ہے اس کے لئے ایتھنز کے لوگوں سے بات کرنے کا یہ آخری موقع ہو۔ اس وقت اسے بے دھڑک اس بات کا اظہار کرنا تھا جو گویا مدت العمر اس کے باطن میں نشوونما پاتی رہی تھی۔ اسے یہ امید تھی کہ شاید ان میں سے کچھ لوگ اس کی باتوں کا مطلب سمجھ سکیں۔

اس لئے اس نے جیوری کے ارکان سے وہ خوشگوار باتیں نہیں کیں جن کی توقع ایک قیدی سے کی جاتی ہے (کہ وہ ان کے رحم و کرم پر ہوتا ہے) بلکہ اس نے وہ حقیقتیں بیان کیں جن کا شعور حاصل کرنا ان کے لئے ضروری تھا۔ اس نے بتایا کہ میں اپنے خاندان کو اپنی سفارش کے لئے کیوں نہیں لایا۔

اپنے دونوں لڑکوں، زن تیپی اور اپنے دودھ پیتے معصوم بچے کو اس بات کی اجازت کیوں نہیں دی کہ رو رو کے، جیوری کے ارکان سے رحم کی درخواست کریں۔ یہ ایک رسم تھی جس سے جیوری کو اپنی طاقت کا احساس ہوتا تھا اور انہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ شفقت کا سلوک بھی کر سکتے ہیں۔ سقراط نے اس بات کی توضیح کی میں نے آخر ایسا کیوں نہیں کیا اس نے انہیں یاد دلایا کہ جیوری کے ہر رکن نے حلف اٹھایا ہے کہ میں قانون کے مطابق انصاف کروں گا اور اپنی مرضی کے مطابق کسی کی طرف داری نہیں کروں گا۔ ہمارا فرض ہے کہ تم کو اس قسم کی ترغیب نہ دلائیں کہ تمہیں اس کی عادت ہی نہ پڑ جائے تمہیں اس خطرے سے بچنا چاہیے۔

اس نے ایتھنز کے شہریوں کو لعنت ملامت کی اور کہا کہ شہر کی سیاسی زندگی کسی اصول کی پابند نہیں ہے۔ اس نے چھ کمانداروں کا قصہ دہرایا۔ شہری یہ قصہ بھول جانا چاہتے تھے کہ اس سے ناخوشگوار یادیں وابستہ تھیں۔ اس نے کہا کہ جس طرح ''تیس'' کی آمریت میں کسی شخص کا ایمان داری سے شہر کے لوگوں کی مخالفت کرنا پر خطر تھا اسی طرح جمہوریت کے زمانے میں بھی ہے یہ بات ناممکن ہے کہ کوئی کسی سرکاری عہدے پر ایمان داری سے کام کرے اور زندہ بچ جائے۔

اس لیے اس نے بذات خود انہیں سدھارنے کا کام اپنے ذمہ لے لیا تھا اس نے کہا میں نے جو اس بات کا ذمہ اٹھایا ہے تو سمجھو کہ دیوتا نے شہر پر بڑا کرم کیا ہے۔ اس نے کہا کہ اگر تم مجھے اس شرط پر معاف کر دو کہ میں اب

خاموش رہونگا تو میں اس شرط پر بھی رہا ہونے سے انکار کردوں گا۔

ایتھنز کے لوگو! اس نے کہا (دراصل وہ سنجیدگی سے ایک ایسے سوال کا جواب دینے کی کوشش کر رہا تھا جوان کے ذہن میں کروٹیں لے رہا تھا) ''میں تمہارا دوست ہوں۔ تم سے محبت کرتا ہوں لیکن اس کے باوجود میں تمہارا حکم نہیں مانوں گا۔ دیوتا کی اطاعت کروں گا جب تک میرے جسم میں جان ہے میں ایک فلسفی کی سی زندگی بسر کروں گا۔ جو شخص بھی مجھے ملے گا میں اس کی ہمت افزائی کروں گا اور اسے بتاؤں گا کہ یہ بات سچ ہے حق ہے۔ میں اس سے سوال کروں گا اس کا جائزہ لوں گا۔ اس کے باطن کو ٹٹولوں گا اور اگر میں دیکھوں گا کہ وہ نیک ہونے کا دعویٰ تو کرتا ہے لیکن حقیقت میں نیک نہیں ہے تو میں اسے ملامت کروں گا میں اس سے کہوں گا کہ وہ بیش بہا چیزوں کو کم بہا تصور کر رہا ہے اور جن چیزوں کی کوئی قیمت نہیں ہے ان کو بیش بہا سمجھ رہا ہے۔ اس لئے ایتھنز کے لوگو! تم چاہو تو مجھے جانے دو اور چاہو تو نہ جانے دو لیکن جو کچھ کرو وہ یہ سمجھ کر کرو کہ میرا طرز عمل یہی ہوگا جس کی میں نے توضیح کر دی۔ خواہ مجھ کو سو بار کیوں نہ مرنا پڑے۔''

یوں گمان ہوتا تھا گویا وہ مرنا ہی چاہتا ہے۔ کچھ لوگوں نے جنہیں اس کی تقریر کے متعلق بعد میں علم ہوا یہی سمجھا وہ بوڑھا ہو چکا تھا اور شاید زندگی سے تنگ آ چکا تھا لیکن اس کی آواز سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ زندگی سے تنگ آ چکا ہے۔ وہ ایماندارانہ لیکن اپنے مخصوص طریقے میں جو لوگوں کو مضطرب کر دیتا تھا اپنے زندہ رہنے کا حق ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس نے ان سے کہا ''انطوس مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ میں نہیں کہتا کہ برا آدمی اچھے آدمی کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ (وہ اچھے آدمی کو قتل کر سکتا ہے شاید اسے جلا وطن بھی کر سکے اور وہ سوچے کہ یہ بڑی خوفناک باتیں ہیں لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں ہے جو حرکت وہ اس وقت کر رہا ہے وہ ان سے زیادہ بری ہے) میں اپنی وکالت نہیں کر رہا ہوں بلکہ تمہاری وکالت کر رہا ہوں''
اس کے بعد اس نے ایک قصہ سنایا۔ جو بہت دنوں تک لوگوں کو یاد رہا بظاہر وہ قصہ ایک مذاق معلوم ہوتا تھا لیکن تھا بالکل صحیح۔ یہ وہی پرانا قصہ تھا کہ ایتھنز جلیل القدر، ایتھنز مضبوط لیکن کاہل گھوڑے کی طرح ہے اور سقراط بڑ مکھی کی طرح ہے دیوتاؤں نے اس گھوڑے کو جگائے رکھنے کے لئے بھیجا تھا اس میں شک نہیں کہ ایتھنز کے لوگ اس بڑ مکھی سے ناراض تھے۔ جس طرح نیند کے ماتے جگانے والے سے خفا ہوتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اسے ایک ہی وار میں ختم کر دیں گے اور پھر سدا آرام سے سوتے رہیں گے لیکن تمہارے لئے بہتر یہی ہو گا کہ تم مجھے زندہ رہنے دو۔'' اس نے انہیں متنبہ کرتے ہوئے کہا تمہارے لئے یہ ناممکن ہو گا کہ تم مجھ جیسا آدمی تلاش کر لو۔''

یہ واقعی مذاق تھا بلکہ لطیفہ اور بڑے مزے کا۔ گھوڑا اور بڑ مکھی، صرف یہی نہیں بلکہ سچ پوچھئے تو یہ مقدمہ سرے سے مذاق ہی تو تھا۔ محض ایک لطیفہ۔ الیسی بیادیز (جو دوسروں کے مقابلہ میں سقراط کے پریشان کن مذاق کے اصل مطلب کو زیادہ سمجھتا تھا) اگر وہاں موجود ہوتا تو کہتا۔ ''اس نے اور اس کی سچائی نے سارے مقدمہ کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس نے اور اس کی سچائی نے

گویا عدالت کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ اور اس نے ججوں کو اپنے متعلق سوچنے اور فیصلہ صادر کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس عدالت میں ملزم گویا صدر عدالت ہے۔ کیونکہ اسے بلند تر نیکی کی اقدار کا علم ہے اور وہ خوفزدہ نہیں ہے۔ وہ چاہیں تو اسے ابھی قتل کر دیں۔ میں نے کتنی ہی بار اس کے مرنے کی خواہش کی لیکن مرنے کو تو وہ کوئی تکلیف دہ عمل تصور ہی نہیں کرتا اور اگر وہ اس کی موت کا فتویٰ صادر کریں گے تو اس کی باطنی قوت ان کو کبھی چین نہ لینے دے گی۔ خود مجھ کو بھی کبھی چین نہیں ملا۔''

آخر سقراط نے متانت سے کہا۔ میری دعا ہے کہ دیوتا اور عدالت ایسا فیصلہ صادر کریں جس میں میری بھی بھلائی ہو اور تم لوگوں کی بھی۔ اب اس کی حیرت انگیز تقریر یکا ایکی ختم ہو گئی۔ سقراط بیٹھ گیا۔ اس کی تقریر کی وجہ سے شور اور ہنگامہ رک گیا تھا۔ اب پھر شور ہونے لگا۔ نقیب نے اعلان کیا کہ اب رائے شماری ہوگی۔

عدالت کی کارروائی ہوتی رہی۔ ٹکٹے ایک طرف لگا دیئے گئے۔ جیوری کے ۵۰۱ ارکان ایک قطار میں اپنی رائے کا نشان ہاتھ میں لئے ہوئے گزرے۔ اب ٹکٹے میز پر رکھ دیئے گئے کہ رائے شماری ہو سکے۔ دیکھئے کیا فیصلہ ہوتا ہے چند لمحوں میں معلوم ہو جائے گا کہ اس کے بعد کوئی اپیل نہ ہو سکے گی۔ صرف سزا بدلی جا سکتی تھی۔ مستغیثوں نے سزائے موت کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن سقراط اگر درخواست کرے تو شاید عدالت سزا کو جلا وطنی سے بدل دے۔ انیطوس کو اب بھی امید تھی کہ وہ یہ درخواست ضرور کرے گا۔

لیجیے وہ نقیب آ رہا ہے۔ اب رائے شماری ہو چکی ہے۔ تیس ووٹوں کے فرق سے فیصلہ ہو گیا ہے۔ عدالت کے منشی نے فیصلہ قلمبند کر لیا ہے۔ نقیب نے سقراط کو اپنے عصا سے چھوا۔ اب معلوم ہوا کہ سقراط مجرم قرار دے دیا گیا تھا۔

اس کے دوست اس فیصلہ کے لئے تیار تھے۔ پھر بھی ان کو یہ فیصلہ بہت شاق گذرا۔ مجمع میں بہت پیچھے جہاں پر راہ چلتے سننے والے کھڑے تھے وہاں بھی تیز وتند جذبات کی ایک لہر سی اٹھی۔ روغن کے بازار کا ایک معمولی تاجر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

عدالت کے قانون کے مطابق سقراط کھڑا ہو کر اپنی سزا کے متعلق تقریر کر رہا تھا۔ اس نے کہا "مجھے رائے شماری کے نتیجے پر تعجب نہیں ہوا۔ ہاں مجھے یہ امید نہیں تھی کہ اتنے کم ووٹ میرے خلاف جائیں گے لیکن اب میری باری ہے کہ میں خود بھی اپنے لئے مناسب سزا تجویز کروں۔ میں نے کوئی خطا نہیں کی بلکہ حقیقت میں تو میں نے شہر پر احسان کیا ہے۔ تو پھر میں اس وقت شہر کے محسن کی حیثیت سے انعام کا مطالبہ کیوں نہ کروں۔ میری تجویز ہے کہ مجھے یہ انعام دیا جائے کہ حکم صادر ہو، سقراط کا خرچ اب شہر برداشت کرے گا۔" اس نے سنجیدگی سے کہا (اگرچہ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ مذاق کر رہا ہے) کھیلوں میں کامیاب ہونے والے کو تم یہ انعام دیتے ہو اور میں نے تو تمہارے لئے دوڑ جیتنے سے زیادہ شاندار کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ میں ایک غریب آدمی ہوں۔ مجھ کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے تاکہ میں تمہاری مدد کرتا رہوں۔"

ان الفاظ نے گویا سزائے موت کی تجویز پر مہر لگا دی۔ یہ بات اسے اور اس کے دوستوں کو بخوبی معلوم تھی۔ جب جیوری کے ارکان غصے میں غرائے تو اس نے ان کے چہروں کی طرف دیکھا، اور مذاق کرنا بند کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ جیوری کے ارکان یہ چاہتے تھے کہ سقراط موت کی بجائے جلا وطنی کی تجویز کرے اور اگر وہ یہ تجویز پیش کرتا تو چونکہ اس کے مخالف ووٹوں کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی اس لئے شاید اس کی جان بچ جاتی۔ اس کی جان اب بھی بچ سکتی تھی۔

''لیکن اگر میں اپنے شہر ایتھنز میں سچ نہیں بول سکتا تو پھر دوسری جگہ لوگ مجھے سچ کیسے بولنے دیں گے۔'' اس نے صدر عدالت سے پوچھا۔ ''اور خاموش میں نہیں رہ سکتا کیونکہ دیوتا نے مجھے بولنے کا حکم دیا ہے۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ تم اس بات کو سچ نہیں مانتے۔ ایتھنز کے شہریو، اگر میں یہ کہوں کہ سب سے بڑی خوبی جو آدمی میں ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر روز نیکی کے بارے میں گفتگو کرے اور ایسی ہی باتیں کرے جیسی میں کرتا رہا ہوں اور اپنے آپ کو اور دوسروں کو پرکھے۔ اگر میں کہوں کہ اپنے آپ کو پرکھنے کے بغیر زندگی بسر کرنا بے معنی بات ہے تو تم بھلا میری بات کو کیسے سچ مانو گے لیکن ایتھنز کے لوگو! میں تم سے حقیقت بیان کر رہا ہوں۔''

ان تمام باتوں کے باوجود اس نے آخر میں ایک تجویز پیش کی یعنی جرمانے کے طور پر ایک حقیر سی رقم پچاس روپے۔ اس نے کہا ممکن ہے اس تجویز پر آپ کو ہنسی آئے لیکن میری یہی بساط ہے۔ میں کوئی ایسی سزا تجویز نہیں کر سکتا

تو جس سے مجھے نقصان ہو۔ لیکن جرمانہ ادا کرنے سے میرا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔'' اور جب اس کے دوستوں نے اس رقم میں تیس گنا اضافہ کر دیا۔ کرائٹو، کرائٹو بولس، اپالو ڈورس اور افلاطون کھڑے ہو کر چلائے کہ ہم تمام رقم اپنے پاس سے دے دیں گے تو وہ ان کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور ان کے تحفے کو قبول کر لیا۔ اس نے عدالت سے کہا ''میرے دوست رقم ادا کریں گے ان پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔''

جو لوگ اسے جانتے تھے ان کو یہ دیکھ کر تعجب نہیں ہوا کہ اس کی اصل تقریر میں حق ہی کا ذکر تھا لیکن آخر میں دوستوں کا ذکر بھی آ ہی گیا۔

اس کے بعد کچھ نہیں ہوا۔ جیسا کہ ہر شخص کو توقع تھی۔ رائے شماری کے بعد موت کی سزا کا حکم برقرار رہا۔ دستور تو یہ تھا کہ اسے فوراً ہی وہاں سے لے جاتے لیکن غیر متوقع دیر ہوئی تو سقراط نے موقع سے فائدہ اٹھا کر عدالت سے مخاطب ہو کر کہا۔

''کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ مجھے اس لئے سزا ہوئی کہ میرے پاس تمہیں متاثر کرنے والے الفاظ کی کمی تھی؟'' ہر خطرہ کسی قسم کا ہی کیوں نہ ہو موت سے نکلنے کے ہزاروں طریقے ہوتے ہیں موت سے بچنا کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن ناراستی سے بچنا بہت ہی مشکل کام ہے۔''

موت سست ہے پھر بھی اس نے مجھے پکڑ ہی لیا۔ میں بھی تو آخر سست سا بوڑھا آدمی ہوں نا۔ بدی تیز رفتار ہے اور اس نے تم کو پکڑ لیا ہے۔ تم بہت عیار اور تیز ہو نا! مجھے تو اپنی سزا ملے گی لیکن تم کو بھی اپنی سزا بھگتنی ہو گی۔

اس کے بعد اس نے اپنے دوستوں کو جو اسے بچانا چاہتے تھے تعلی
دی۔ اس نے کہا میں دن بھر منتظر رہا کہ شاید دیوتا مجھے ٹوک دیں گے یا متنبہ
دیں گے لیکن نشانِ ربانی ظاہر نہیں ہوا۔ معلوم ہوا کہ میرے لئے عدالت میں
جانا ہی اچھا تھا جو کچھ میں نے کہا خوب کہا اور نتیجہ بھی اچھا ہی ہوگا۔ یا تو موت
صرف ایک نیند تھی یا پھر وہاں بھی (دوسری دنیا میں) اپنا کام اسی طرح کرتا
رہوں گا جس طرح یہاں کرتا تھا۔ اس حقیقت پر تو دل و جان سے ایمان لے آؤ
کہ نیک آدمی زندہ ہو یا مردہ اسے بدی اور ناراستی متاثر نہیں کر سکتی۔ نہ بدی
اسے نقصان پہنچا سکتی ہے۔ دیوتا اس کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔''

چند منٹوں کے بعد جب قید خانے کے حکام اسے لینے کے لئے آ گئے
تو ان کے دل میں سقراط کی یہی بات گویا یادگار رہ گئی۔

سقراط کی موت کی کہانی۔ کرائیٹو کی زبانی

میں سقراط کا دوست کرائیٹو ہوں اور داستان کا باقی حصہ بیان کرتا
ہوں۔
ہر سال موسم بہار میں ہم ایتھنز کے لوگ ڈے لوس پر ایک جہاز اور
سفارت بھیجتے تھے۔ یہ مقام ایک جزیرہ ہے جہاں اپالو دیوتا نے جنم لیا تھا۔ اس
طرح ہم اس نجات کی یادگار مناتے تھے۔ جب دیوتا نے کریٹ کے "مردگاؤ
سر" (مینوتور) کو قتل کرنے میں ہمارے ہیرو تھیسی یوں کو مدد دی تھی "مینوتور"
مردگاؤسر" ہر سال ہمارے نوجوانوں کی بھینٹ لیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان دنوں
کو ہم لوگ بہت مقدس اور متبرک خیال کرتے ہیں۔ جب تک یہ جہاز باہر رہتا
ہے (اور اگرچہ سفر طویل نہیں ہوتا لیکن مخالف ہوائیں اکثر اسے جلد واپس آنے
سے باز رکھتی ہیں) اس عرصہ میں کسی قیدی کو موت کی سزا نہیں دی جاتی۔ یہی
سبب ہے کہ ہمارا دوست سقراط اتنا عرصہ ہمارے ساتھ رہا (یہ خلاف توقع بات تھی
) معمول کے مطابق سزا پانے کے دوسرے دن ہی اسے زہر کا پیالہ پی لینا
چاہیے تھا لیکن اس کا مقدمہ شروع ہونے سے ایک دن قبل جہاز پر پھول
چڑھائے جا چکے تھے (سفارت کے افتتاح کا یہی طریقہ رسماً محفوظ رہتا ہے)

اور چونکہ جہاز کے جاتے اور آتے وقت ہوائیں مخالف تھیں لہٰذا ہمارے دوست
نے قید خانہ میں پورا ایک مہینہ بسر کیا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس انتظار کا سقراط پر کوئی اثر ہوا یا نہیں۔ ہم اس
کے پاس روزانہ جاتے تھے اور ہم نے اس میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھی۔ اگرچہ
بیڑیاں اس کے پیروں کو ضرور تکلیف دیتی ہوں گی۔ پھر وہ سورج کی روشنی سے
دور رہنے کا عادی نہیں تھا۔ ان حالات میں جیلر اس سے جتنی مہربانی کا سلوک کر
سکتا تھا اس سے دریغ نہیں کیا گیا اور آخر میں تو اس کا جو رویہ سقراط کے ساتھ
میں نے دیکھا اس سے میں یہ اندازہ کرتا ہوں کہ وہ بھی اس سے محبت کرنے لگا
تھا۔

میں خود بھی جیلر سے دوستی کرنے کے حق میں تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس
سے فائدہ پہنچ سکتا ہے اور پہنچ ہی جاتا لیکن .... خیر سنئے۔

جیسا کہ میں نے کہا، انتظار سے سقراط میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔
اس زمانہ میں موت کے متعلق اس نے ضرور زیادہ سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اس
سے پہلے ہمیشہ وہ زندگی کے متعلق سوچا کرتا تھا۔ میں نے سقراط کے سوا کسی شخص
میں زندگی اس طرح موجزن نہیں دیکھی۔ لیکن اس وقت اس کے سامنے ایک
بالکل دوسرا ہی مسئلہ تھا اور وہ اسے بالکل اپنے طریقے کے مطابق حل کرنے کی
کوشش کر رہا تھا۔ سقراط کے ہاتھ میں کوئی چیز مر نہیں سکتی تھی۔ یہاں تک کہ
موت بھی، وہ مردہ نہیں ہو سکتی تھی۔ زندگی کے اس آخری مہینہ میں ہم سب آخر
وقت تک اسی کے سہارے زندہ رہے، ہمیں سہارا دینے کے لئے واقعی اس کے

اس میں زندگی کا موجزن ہونا ضروری تھا۔

پھر ہم پر کیا گزر رہی تھی اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ مقدمہ کے دن اس نے گویا ہماری باطنی عظمتوں کو اجاگر کر دیا تھا۔ اس دن ہم تیار تھے کہ سقراط کو مرنا ہے تو چلوں یوں ہی سہی۔ لیکن اس کی شخصیت اتنی عظیم اور جلیل تھی کہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ وہ ہماری خاطر اپنے کو ذلیل کرے۔ لیکن جب وقت نکل جاتا ہے تو لوگ باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اور انسان پریشان ہو جاتا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔ بہر حال زندگی زندگی ہے اور موت موت ہے، پھر ہم سوچتے ہیں کہ شاید ہم لوگوں نے حماقت سے کام لیا، اور شاید سقراط بھی احمق ہی تھا۔ دنیا کے نزدیک تو وہ یقیناً احمق تھا اور اس دنیا میں پھر دنیا کے لوگوں کے سوا اور اہمیت کس چیز کو ہے۔

اس کے بعد ہمارا دوست سمیبس، تھیبز سے ایک بڑی رقم لے کر واپس آیا اس کا دوست سیبیز حسب معمول اس کے ساتھ تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر ضرورت ہو تو مزید رقم کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اور بہت سے لوگ بھی مدد کرنے کو تیار تھے۔ منصوبہ یہ تھا کہ جیلر اور پہرہ داروں کو رشوت دے کر سقراط کو اس کے ہوا خواہوں کے پاس تھیسلی بھیج دیا جائے۔ اگر وہ اپنے بچوں کو ایتھنز میں چھوڑ جانا چاہتا ہو تو ہم اس کی دیکھ بھال کر لیں گے۔ میرا اپنا خیال یہ تھا کہ وہ ان کو تمام زندگی کے لئے ایتھنز کی شہرت سے محروم کرنا پسند نہیں کرے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ میں اس منصوبے کے متعلق زیادہ پر امید نہیں تھا۔

ہم جیلر کو رشوت بھی دے سکتے تھے۔ بھیس بدلنا بھی مشکل نہیں تھا اور میرے پاس ایک بھروسے کا آدمی تھا جو خچروں کے ساتھ جا سکتا تھا لیکن ہر بات کا انحصار تو سقراط کی رضا مندی پر تھا۔ میں اس کا اس وقت سے دوست تھا جب سمیئس اور سینیز دونوں دودھ پیتے بچے تھے۔ میں سقراط کو بخوبی جانتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ موت سے بالکل خائف نہ تھا اور مرنے پر قطعی شرمندہ بھی نہ تھا۔ اب وہ اسے ایک ضروری مہم سمجھتا تھا اور اپنی راہ پر گامزن رہے گا۔ بھاگنے کے لئے وہ صرف اس صورت میں تیار ہوگا جب ہم یہ ثابت کر دیں کہ بھاگنا ہی اچھا تھا یا حق تھا۔

ان دوستوں نے اس موضوع پر اس سے باتیں کرنے کے لئے میرا انتخاب کیا۔ اگر سمیئس راضی ہوتا تو حق اسی کا تھا اور دوستوں سے ہر شخص بات کرنے کے معاملے میں مجھ سے بہتر تھا لیکن انہوں نے مجھے چنا اور مجھے اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے لئے زیادہ دیر تک سوچنا نہیں پڑا۔ اس رات اس متبرک جہاز کے کچھ آدمی راس سونیم کے بری راستے سے ایتھنز پہنچ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ جہاز راس سے گزرنے کے لئے صرف ہوا کے ٹھہرنے کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ کل تک آجائے گا اور اس طرح سقراط کو پرسوں مرنا ہوگا۔

جیسا میں کہہ چکا ہوں، جیلر میرا دوست تھا۔ اس نے دوسرے دن صبح ہونے سے پہلے ہی مجھے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ اسے یہ تو بتانا ہی پڑا کہ آخر ہمارا مقصد کیا ہے لیکن وضاحت سے نہیں کی گئی۔ بہرحال وہ مجھے سقراط کے کمرے میں تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔ ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ سقراط سو رہا تھا۔

میں اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کو سوتے دیکھتا رہا۔ وہ بالکل ساکت لیٹا ہوا تھا۔ پھر وہ خود بخود اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اٹھتے ہی اس نے مجھ سے کئی سوال کر ڈالے تم کیوں آئے ہو؟ اس وقت کیا بجا ہے؟ جیلر نے تمہیں اندر کیسے آنے دیا۔ تم نے آتے ہی مجھے جگا کیوں نہیں دیا؟ سب سے پہلے میں نے اسے جہاز کے آنے کی خبر سنا دی۔ اسے یہ خبر سنانے میں کوئی ہرج نہیں تھا۔ ڈر تو مجھے دوسری قسم کے سوالوں کا تھا۔

اس نے مجھے ایک خواب سنایا جو ابھی بیدار ہونے سے پہلے وہ دیکھ رہا تھا۔ ایک سفید پوش عورت اس سے وہی الفاظ کہہ رہی تھی۔ جو ایکیلیز نے اس وقت کہے تھے جب وہ ٹرائے سے بھاگنے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اس عورت نے اس سے کہا کہ تم تیسرے دن گھر پہنچ گے اور اس کی تعبیر اس نے یہ نکالی کہ وہ کل نہیں پرسوں مرے گا۔ اس کی بات سے صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ اس کے دماغ میں کیا خیالات چکر لگا رہے تھے۔)

اس کے بعد میں نے بات شروع کی۔ میں نے جو منصوبہ بنایا تھا جلدی جلدی بیان کر دیا۔ سب سے پہلے تو میں نے کہا کہ تم اپنے دوستوں کی شہرت اور وقار کو ٹھیس پہنچا رہے ہو۔ میں نے اس سے کہا کہ لوگ یا تو ہم لوگوں کو بزدل خیال کریں گے یا کہیں گے کہ ہمیں تم سے اتنی محبت نہیں تھی کہ ہم تمہیں رہا کرانے کے لئے کچھ رقم صرف کرتے۔ یہ بات میرے ذہن میں تھی کہ شاید وہ اس لئے انکار کر دے کہ ہمیں خطرے سے دوچار ہونا پڑے گا۔ میں نے کہا ہمیں کوئی خطرہ نہیں اور اگر ہے تو خطرہ مول لینا ہی ہمارا حق ہے۔ میں

نے سمکلیس اور ان دوسرے دوستوں کا ذکر کیا جو اس کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کہا اگر ہم پر کوئی مصیبت آئی تو ہم رشوت دے کر اس سے چھٹکارا حاصل کر لیں گے اور ہمارے دوست جو تھیسلی میں ہیں تمہارے آرام کا خیال رکھیں گے اور تمہاری حفاظت کریں گے آخر کار میں نے اس سے اس قسم کا مباحثہ شروع کر دیا جس کا وہ منتظر تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ اس طرح ہتھیار ڈال دینا صحیح نہیں کہ غلط کار لوگوں کو فتح ہو اور تمہارے بچے یتیم ہو جائیں۔ میں نے کہا کہ لوگ اس مقدمہ کے متعلق طرح طرح کی باتیں کریں گے۔" اس مقدمہ کو کبھی عدالت میں پیش ہونا نہیں چاہیے تھا۔" اس کا وہ فیصلہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ جو ہوا۔" سقراط کے دوست سب بزدل اور کمزور تھے کہ اس بارے میں کچھ نہ کر سکے۔" میں نے کہا کہ اب سوچنے کا وقت نہیں رہا۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے آج ہی رات کو کرنا ہے۔"

جب میں جوش میں ہوتا ہوں تو الفاظ میرے منہ سے گرتے پڑتے نکلتے ہیں لیکن وہ نہ تو ہنسا اور نہ اس نے مجھے ٹوکا۔ جب میں بات کر چکا تو اس نے مجھ سے کہا کہ تمہارا جوش بہت ہی بیش قیمت ہے۔ بشرطیکہ اس کا رخ صحیح ہو۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ ہمیں کسی معاملہ کے اچھے اور برے پہلوؤں کو ایک ساتھ دیکھنا چاہیے جب اس نے یہ کہا تو میرا دم گھٹنے لگا۔ کیونکہ وقت کی کمی کی بنا پر اس بات کا خطرہ تھا کہ کہیں ہم غلط فیصلہ نہ کر لیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہے گا اور سچ پوچھو تو اس وقت میری خواہش بھی یہی تھی۔

اس کے بعد اس نے کسی فیصلہ تک پہنچنے کے لئے باقاعدہ گفتگو شروع

کی۔ اس نے وہ اصول مجھے یاد دلائے جن پر اس سے پہلے کئی بار ہم متفق ہو چکے تھے۔ پھر اس نے ایک ایک کر کے سوال کے مختلف پہلوؤں پر بحث کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے اس نے اس بات کا جواب دیا کہ لوگ کیا کہیں گے مجھے اس نے یہ کہہ کر اپنا ہم خیال بنا لیا کہ ہم رائے عامہ کو یہ منصب نہیں بخش سکتے کہ وہ راستی اور ناراستی کے درمیان فیصلہ کرنے کی مجاز ہے۔ اس طرح باطنی اور روحانی فساد پیدا ہو سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی کھلاڑی اپنے تربیت دینے والے کے بجائے عام لوگوں کی رائے پر عمل کر کے اپنی جسمانی حالت بگاڑ سکتا ہے۔

میری دوسری بات کا جواب دیتے ہوئے اس نے کہا کہ زندہ رہنا اتنا اہم نہیں ہے جتنا صحیح انداز سے زندہ رہنا۔ اس بات میں بھی مجھے اس سے اتفاق کرنا پڑا۔

اس نے تیسری بات یہ کہی کہ بدی کا جواب بدی نہیں ہے۔ بہت دن ہوئے جب اس نے مجھ سے پہلی بار کہا تھا کہ نیک آدمی سے بدی کا سرزد ہونا ممکن نہیں تو میں نے اس خیال کو مضحکہ خیز تصور کیا تھا لیکن اب میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا خیال ٹھیک تھا۔ مجھے اس معاملے میں بھی اس کا ہم خیال ہونا پڑا اور وہ برابر اس بات کا اطمینان کر رہا تھا کہ میں واقعی اس سے متفق ہو گیا ہوں کہ نہیں۔

اس نے کہا" میں جانتا ہوں ان باتوں پر بہت کم لوگ یقین رکھتے ہیں اور یقین رکھنے والوں کی تعداد ہمیشہ کم رہے گی۔ وہ لوگ جو یقین رکھتے ہیں اور وہ جو لوگ یقین نہیں رکھتے یہ دونوں کسی معاملے میں کبھی متفق نہ ہوں گے۔

مجھے اس بات کی بھی تائید کرنا پڑی۔

اس کے بعد اس نے بحث مباحثہ ترک کر دیا اور شہر کے قوانین کی باتیں کرنے لگا۔ میں اسی وقت سمجھ گیا کہ اپنے مقصد میں ناکام رہا ہوں۔ اس نے مجھ سے کہا ”اگر میں بھاگ جاؤں تو یہ قوانین بہ زبان حال کہیں گے کہ ہم نے سقراط کے پیدا ہونے کے وقت سے لے کر مدت العمر اس کی حفاظت کا فریضہ سرانجام دیا اور ادھر میری سنو تو جب میں جوان ہوا اور قوانین کو سمجھنے کے قابل ہو گیا تو میں نے انہیں قبول کر لیا اور ان کا پابند رہا اور ان سے بھاگ کر کسی ایسے شہر جانے کی کوشش نہیں کی جس کے قوانین اس سے بہتر ہوتے۔ بتاؤ اب میں قوانین کیسے توڑ سکتا ہوں اور اگر میں ایسا کروں تو پھر آئندہ نیکی کے متعلق کیسے گفتگو کر سکوں گا۔“

”میرے پیارے دوست کرائٹو! قانون کی یہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے اور ان الفاظ کی آواز میں وہ موسیقی ہے کہ میرا دل کسی اور صدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر تم ان قوانین کی مخالفت کرو گے تو تمہاری باتیں اکارت جائیں گی۔ اس کے بعد اگر تم کچھ کہنا چاہتے ہو تو کہو۔“

”سقراط مجھے کچھ نہیں کہنا“ میں نے جواب دیا اور یہ حقیقت تھی لیکن یہی بات دوسروں تک پہنچانا بڑا مشکل کام تھا۔“

جہاز آ گیا اور شام تک ہمیں اس کے آنے کی اطلاع ہو گئی تو دوسرے دن صبح ہم قید خانے جلدی ہی پہنچ گئے۔ پہلے تو چوبدار ہمیں اندر نہیں جانے دیتا

تھا۔ اس نے کہا کہ جیل کے حکام سقراط کے کمرے میں ہیں۔ وہ اس کی زنجیریں کٹوا رہے ہیں اور دوسرے ضروری احکام دے رہے ہیں جب وہ لوگ چلے گئے تو وہ ہمیں اندر لے گیا۔

سقراط بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کی زنجیریں کٹ چکی تھیں۔ زن ٹیپی بچے کو لئے قریب ہی بیٹھی تھی۔ وہ تمام رات اس کے پاس رہی تھی۔ لیکن اب اس وقت یہ سوچ کر کہ یہ اس کا آخری دن ہے وہ رونے لگی۔ سقراط نے مجھ سے کہا کہ میں اپنے کسی آدمی کے ساتھ اسے گھر بھجوادوں۔

اب ہم اس کے پاس تنہا رہ گئے۔ وہ بستر پر بیٹھ گیا اور اپنی پنڈلیاں ہاتھوں سے ملنے لگا کہ سن ہو گئی تھیں۔ ہم مختلف موضوعات پر باتیں کر رہے تھے۔ اس نے کہا کہ خواب میں اکثر مجھ سے کوئی کہا کرتا تھا کہ شعر کہو۔ نغمہ طرازی کرو۔ میں کچھ اشعار نظم کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ نغمے سے مراد غالباً فلسفہ ہے کیونکہ یہ نغمہ گری شاعری کی اعلیٰ ترین شکل ہے لیکن اس نے احتیاطاً اپالو کی تعریف میں ایک گیت لکھا تھا اور لقمان کی ایک آدھ کہانی کو نظم کر دیا تھا۔

اس کے بعد "موت" گفتگو کا موضوع بن گئی۔ آخر اس کے معنی کیا ہیں اور اس کے بعد کیا ہوگا؟ اگرچہ ہم لوگ بھی اس موضوع پر بات کرنا چاہتے تھے لیکن کچھ جھینپ رہے تھے۔ وہ ہم سب سے زیادہ عقل مند تھا۔ ہم سب ایک مشکل مسئلہ کا حل دریافت کرنا چاہتے تھے اور یہی ایک آخری موقع تھا۔ لیکن اسے کوئی جھجک نہیں تھی۔ اس کی فکر اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ موت اس کی یا کسی اور کی زندگی کے ختم ہو جانے سے عبارت نہیں ہے۔ اس کا خیال تھا کہ

حالات کی بنا پر شاید اس کا فیصلہ غیر جانبدارانہ نہ ہو۔ اس لئے وہ اس مسئلہ پر بحث کرنا چاہتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ جب ہم نے اس سے محض اس لئے اختلاف نہیں کیا تھا کہ وہ آزردہ ہو گا تو اس نے ہمیں یہ سمجھایا کہ ہمیں کسی کی خوشنودی سے زیادہ حق کا خیال کرنا چاہیے۔ اس نے کہا ''اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں صحیح کہہ رہا ہوں تو مجھ سے اتفاق کرو اور اگر ایسا نہیں ہے تو تم میرے خلاف دلیل پیش کرو۔ تم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ میں اپنے ساتھ تم کو بھی دھوکا تو نہیں دے رہا ہوں اور شہد کی مکھی کی طرح تم میں اپنا ڈنک کو چھوڑ کر نہیں اڑ رہا ہوں۔''

جو باتیں اس موقع پر ہوئیں ان کے متعلق میں اس سے زیادہ تمہیں نہیں بتا سکتا۔ یہ افلاطون کی قسمت میں لکھا تھا کہ وہ اس دن کی ساری گفتگو تفصیل سے قلم بند کرے۔ اگرچہ وہ اس دن اتنا بیمار تھا کہ بستر سے اٹھ کر آ بھی نہیں سکا۔ اس نے ہم سب کی باتیں سنیں اور میرا خیال ہے کہ بعد میں اس دن کی باتیں اس کے ذہن میں گردش کرتی رہیں اور گویا اس کے افکار نشو ونما پاتے رہے سقراط بھی چاہتا تھا کہ ہم سب کی کسی نہ کسی طرح نشو ونما ہو۔ ممکن ہے وہ دن میری ذہنی نشو ونما میں مددگار ثابت ہوا ہو۔ لیکن مجھے جو چیز یاد ہے وہ میرا دوست ہے۔ اس کے دلائل نہیں۔ وہ بذات خود ایک بہترین دلیل تھا اور آخر وقت تک یہی کہتا رہا کہ موت اس کا خاتمہ نہیں کرے گی اور جب میں اس کے متعلق سوچتا ہوں تو میں بھی یہی کہتا ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ جب وہ راج ہنس کی باتیں کر رہا تھا تو کیسا نظر آتا تھا

سے دیکھ کر مجھے راج ہنس کے آخری میٹھے نغمے کی یاد آئی، جو وہ اپنی موت سے پہلے گاتا ہے۔ بہت سے لوگ سوچتے ہیں کہ راج ہنس گانے کے ذریعہ دکھ کا اظہار کرتا ہے۔ حالانکہ دکھ میں پرندے گاتے نہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ راج ہنس وہ پرندہ ہے جو خصوصاً اپالو سے منسوب ہے اور سقراط بھی اپالو کا عبادت گزار تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اپالو کے خدام پیشن گوئی کر سکتے ہیں۔ موت سے پہلے انہیں دوسری دنیا کی اچھی چیزیں نظر آتی ہیں اور اس لئے وہ خوشی میں گاتے ہیں۔

آخر میں کچھ باتیں ایسی بھی ہوئیں جنہیں میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ یہ بیان کر رہا تھا کہ شاید مرنے کے بعد مجھ سے اور تم سے دیوتا انصاف کریں گے اور ہماری روحیں پاک وصاف ہو جائیں گی۔ اس نے اس کی تفصیلات تو نہیں بتائیں لیکن یہ کہا کہ مناسب یہی ہے کہ اس بات کو مان لو۔ ہمت سے کام لو، اپنی روحوں کا خیال رکھو۔ انہیں ہم آہنگی، راستی، دلاوری، سخاوت اور صداقت کا لباس پہناؤ۔ تب میں نے اس سے پوچھا۔ ''ہم تمہارے لئے کیا کریں؟'' اس نے جواب دیا۔ ''کوئی نئی بات نہیں۔ صرف اپنا خیال رکھو۔ بہت زیادہ الفاظ استعمال کرنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ اصل چیز یہ ہے کہ ہم زندگی کیسے گزارتے ہیں۔''

سب سے آخر میں نے پوچھا ''ہم تمہیں کیسے دفن کریں؟'' اس سوال کے جواب میں اس نے جو کہا وہ مجھے پوری طرح یاد ہے۔

''جس طرح تم چاہو لیکن سوال یہ ہے کہ تم مجھے پکڑ بھی پاؤ گے یا میں تمہاری گرفت سے نکل جاؤں گا۔'' وہ ہنسا لیکن اس کی ہنسی میں نرمی اور شفقت

تھی۔ پھر دوسروں کی طرف دیکھ کر کہنے لگا ''میں کرائٹو کو قائل نہیں کر سکتا کہ میں وہی سقراط ہوں جو ابھی باتیں کر رہا تھا اور دلائل پیش کر رہا تھا۔ اس کا خیال ہے کہ میں وہ مردہ جسم ہوں جس کو وہ ابھی تھوڑی دیر میں دیکھے گا اور اسی لئے وہ مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ ''ہم تمہیں کیسے دفن کریں۔''

میں یہاں کتنی دیر سے باتیں کر رہا ہوں اور یہ کہہ کر تم کو تسلی دے رہا ہوں اور خود کو بھی کہ زہر پینے کے بعد میں تمہارے پاس نہیں رہوں گا۔ میں ان لوگوں سے جا ملوں گا جن پر سعادت سایہ افگن ہے اور جو ایسی جگہ رہتے ہیں جہاں ابدی مسرت پائی جاتی ہے لیکن بظاہر میری اس تمام گفتگو کا کرائٹو پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم میرے اور کرائٹو کے درمیان ضامن ہو جاؤ جس طرح وہ عدالت میں میرا ضامن ہوا تھا لیکن ضمانت کا رخ بدل دو۔ اس نے ضمانت دی تھی کہ میں ایتھنز میں ٹھہروں گا۔ تم لوگ یہ ضمانت دو کہ مرنے کے بعد میں یہاں نہیں ٹھہروں گا بلکہ چلا جاؤں گا۔ تب کرائٹو کو اتنا دکھ نہیں ہوگا اور جب وہ میرے جسم کو جلتے یا دفن ہوتے دیکھے گا تو وہ یوں غم نہیں کرے گا گویا مجھ پر مصیبتیں گزر رہی ہیں اور میرے جنازے پر یہ نہیں کہے گا کہ یہ سقراط کا جنازہ ہے۔

''پیارے کرائٹو! جھوٹے الفاظ صرف آپس میں بے جوڑ ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ روح میں بدی پیدا کرتے ہیں۔ ہمت رکھو اور یہ کہو کہ یہ میرا جسم ہے جسے تم دفن کر رہے ہو اور اس کے ساتھ جو چاہو کرو اور جو مناسب سمجھو ادا کرو۔''

اس کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لئے سب سے الگ ہو گیا اس نے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ پھر غسل کیا اور بچوں سے زن تیپیا سے اور دوسری رشتہ دار عورتوں سے جو ان بچوں کے ساتھ آ گئی تھیں، باتیں کرتا رہا۔ اس میں کچھ وقت صرف ہوا جب ہم باہر کے کمرے میں دوستوں کے پاس واپس گئے تو شام ہو چکی تھی۔

وہ ہم لوگوں کے ساتھ خاموش بیٹھا ہوا تھا کہ جیلر آ گیا۔ اس نے کہا کہ وقت آ گیا ہے۔ پھر اس نے سقراط سے معافی مانگی۔ رونے لگا اور کہا کہ "اب تک جتنے آدمی یہاں آئے ہیں تم ان سب سے زیادہ شریف، نرم دل اور اچھے ہو۔" سقراط نے اس کے ساتھ بڑی نرمی سے باتیں کیں۔

میں نے سقراط سے کہا کہ سورج ابھی پہاڑوں پر چمک رہا ہے۔ اس لئے ابھی زہر پینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دراصل یہ میرا خوف تھا جو بول رہا تھا چونکہ اسے کوئی خوف نہیں تھا اس لئے اس نے مجھے زہر منگوانے کو کہا اور آدمی پیالہ لے کر آ گیا۔

"کیا خیال ہے تمہارا میں دیوتا کی خاطر تھوڑا سا زہر زمین پر گرا دوں؟" سقراط نے پوچھا اور آدمی نے جواب دیا "نہیں۔" اس نے کہا "میں تمہاری بات کا مطلب سمجھتا ہوں لیکن مجھے دعا تو مانگنی چاہیے کہ میرا اس دنیا سے سفر سعادت کا سفر ہو۔ یہی میری دعا ہے دیوتا اسے منظور کریں۔" اور اس نے پیالہ اٹھا کر پی لیا۔

اب میری قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ میں اٹھ کر کمرے

میں دوسری طرف چلا گیا تا کہ روسکوں۔ لڑکا فیڈو میرے ساتھ چلا آیا لیکن اپالو ڈورس جو دن بھر روتا رہا تھا اس نے اتنے زور سے چیخ ماری کہ اگر سقراط ہم کو روک نہ لیتا تو ہم سب پھوٹ کر رونے لگتے۔

اس نے سختی سے کہا ”یہ تم لوگ کیا انوکھی بات کر رہے ہو؟ میں نے عورتوں کو اسی لئے باہر بھیج دیا تھا تا کہ وہ یہ غلطی نہ کریں۔ میں نے یہ سنا ہے کہ مرد کو خاموشی سے مرنا چاہیے۔ اپنے اوپر قابو رکھو اور صبر سے کام لو۔“

ہم سب نے شرمندہ ہو کر اپنے آنسو روک لئے اور احکام کے مطابق سقراط ٹہلتا رہا۔ اس کے بعد وہ کمبل اوڑھ کر بستر پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے چہرہ کھولا اور کہا: (یہ اس کی آخری بات تھی)

”کریٹو ہم پر واجب ہے کہ ایک مرغ شفا کے دیوتا کے نام پر قربان کریں۔ کیا تم یہ قربانی کر دو گے؟“ دیکھنا بھولنا مت۔

میں نے دوسرے دن مرغ کی قربانی دے دی۔ شفا کا دیوتا سمجھ جائے گا کہ سقراط نے یہ قربانی دیتے وقت کس نیک مقصد کو ملحوظ رکھا تھا۔ ہم نے سقراط کے جسم کو دفن کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ سقراط وہاں بذات خود موجود نہیں تھا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ جہاں بھی ہے اچھا ہے۔

......ختم شد......

نصائح سقراط
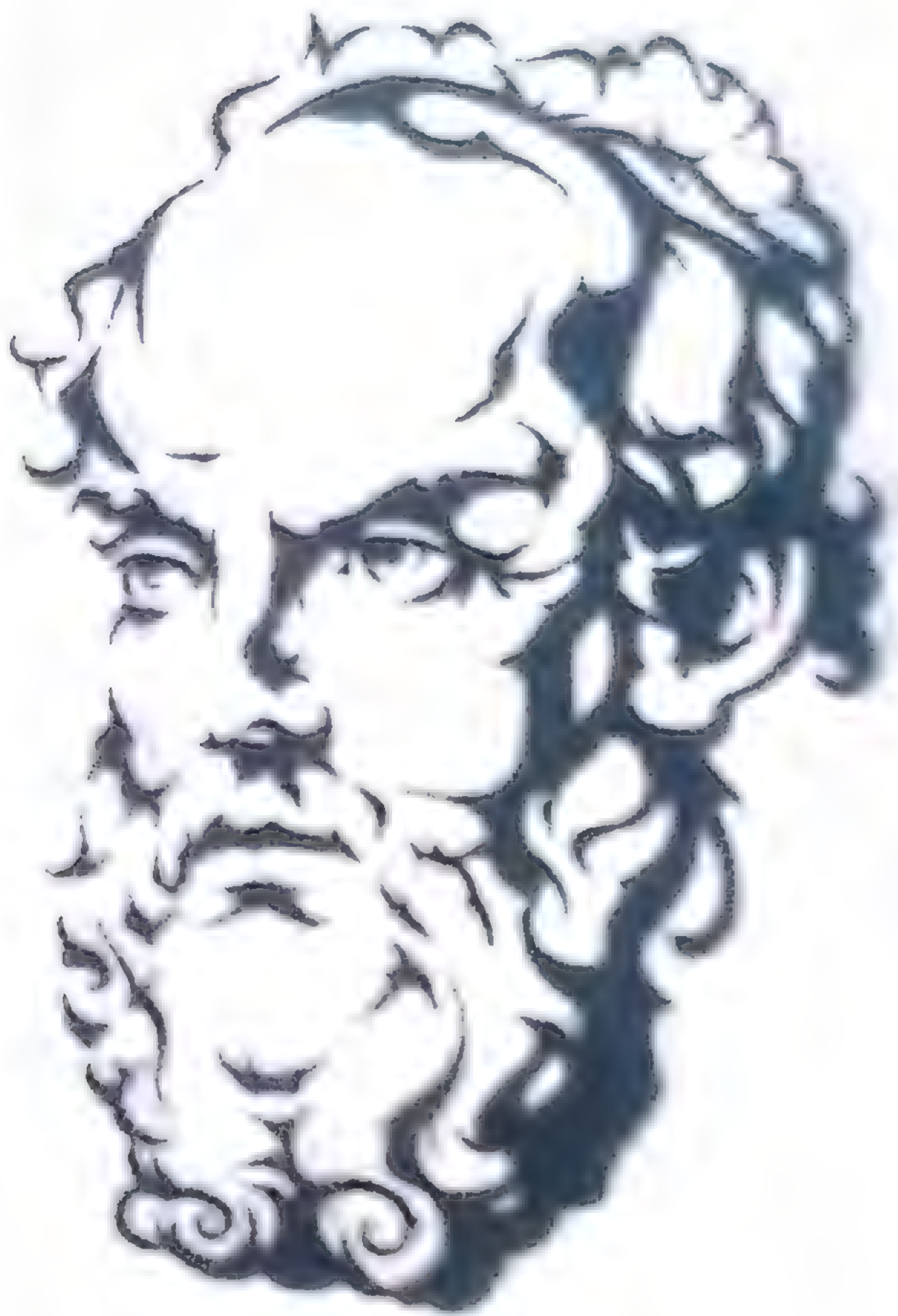
- نامعلوم اور پیچیدہ راستوں کی کوتاہی پر فریفتہ مت ہو اور سیدھے راستوں کی درازی سے اندیشہ مت کر۔
- بچپن میں شرم و حیا، نوجوانی میں اعتدال اور پیری میں کفایت شعاری و عاقبت اندیشی ضروری ہے۔
- نیک بات کے تسلیم کرنے میں صرف اس خیال سے کہ اس کے کہنے والا ایک حقیر آدمی ہے شرم نہیں کرنی چاہئے۔

- آدمی کے حال کا دریافت کرنا سخت مشکل ہے جب تک کہ بارہا آزمائش نہ کی جائے اور جب تک کہ معاملہ نہ پڑے اعتماد نہ کر۔
- خوبصورتی چندروزہ حکومت ہے۔
- اگر ہم اپنی مصیبتوں کا تبادلہ کر سکتے تو ہر شخص اپنی ہی مصیبت کو غنیمت جانتا۔
- نیک آدمی کو زندگی میں یا موت کے بعد کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔
- بے شک عقل سب سے اچھی چیز ہے اور تمام امور کا انحصار اسی پر ہے مگر بعض اشیاء ایسی ہیں جنہیں ہم روزمرہ زندگی میں دیکھنے کے باوجود اس کی غرض و غایت نہیں سمجھتے۔
- جو خدا سے نہیں ڈرتا وہ سب سے ڈرتا ہے اور جو خدا سے ڈرتا ہے وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔
- لوہا صرف لڑائی کے وقت سونے سے بہتر سمجھا جاتا ہے مگر عقل ہر جگہ اور ہر وقت سونے سے زیادہ قیمتی ہے۔
- موت سے بچالینا مشکل نہیں ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ انسان گناہ سے پاک رہے۔
- خودکشی بہت بڑا گناہ ہے۔
- سب سے بڑھ کر نیک چلن ہونا اعلیٰ درجے کی خوبی ہے۔ جب کوئی کام نہ ہو تو بیکاری کی حالت میں دماغی طاقت سے کبھی قرض نہ لو جب تک کہ اس کے اتارنے کا طریقہ نہ سیکھ لو۔

- اس شخص کی حالت واجب الرحم ہے جس کا مصاحب وزیر جاہل ہو۔
- جس کا مقصد حیات ابدی ہے اسے چاہئے کہ خواہش نفسانی بلکہ جمیع افعال جسمانی سے حتیٰ الوسع دوری اختیار کرے تاکہ مقصود حاصل ہو۔
- جو شخص اچھے اور برے میں تمیز نہ کر سکے اس کا شمار مُردوں میں ہے۔
- خوبی اور نیکی دولت سے نہیں بلکہ دولت خوبی اور نیکی سے وجود میں آتی ہے۔ یاد رکھو! فتح طاقت کی نہیں صداقت کی ہوتی ہے۔
- جب انسان کسی کے ساتھ کسی طرح کی نیکی نہ کر سکے تو اس کی برائیوں ہی سے اسے مطلع کرتا رہے۔
- طامع کی دولت کا حال آفتاب کا سا ہے کہ غروب ہو کر کسی کو خوش نہیں کرتا۔
- دوستی وہی ترقی کر سکتی ہے جب فریقین کے دولت و اقبال میں مشارکت، خیالات میں مطابقت اور حالت میں موافقت ہو۔
- دوستی کی شیرینی کو ایک دفعہ کی رنجش کی یاد ہمیشہ زہر آلود کرتی ہے۔
- زمانہ پیری نہایت مسرت ناک ہے بشرطیکہ صحت اور سچا دوست میسر ہو۔
- تحریر ایک خاموش آواز ہے اور قلم ہاتھ کی زبان ہے۔
- ہر فضیلت کی ایک حد متعین ہے جب اس سے تجاوز ہوگا خواہ افراط کی طرف خواہ تفریط کی طرف تو فضیلت رزیلت بن جاتی ہے اور نیکی برائی بن جاتی ہے۔

- نیک خو ہونا تمام حکمت کا خلاصہ ہے اس سے امن اور سلامتی حاصل ہوتی ہے اور دوسروں کے دِل میں محبت پیدا ہوتی ہے۔
- انسان کیلئے شرمناک فعل ہے کہ بے پروائی کی وجہ سے قبل از وقت بوڑھا ہو جائے اور یہ نہ دیکھ سکے کہ اگر اس کا جسم صحیح وسالم رہتا تو وہ کیا کچھ بن جاتا۔
- عالم دین کا طبیب ہے اور مال دین کا مرض۔ جب طبیب خود مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس سے دوسروں کا علاج نہیں ہو سکتا۔
- جوانی میں آدھا کھاؤ اور بچاؤ کہ جوانی کے وقت جمع کیا ہوا بڑھاپے میں کام آتا ہے۔
- جس چیز کا علم نہیں اس کے بارے میں کچھ مت کہو۔
- جو راستہ معلوم نہیں اس پر سفر نہ کرو۔
- تریاق کی موجودگی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کی اُمید پر زہر کھالیا جائے۔
- نیک چلن ہونا اعلیٰ درجے کی خوبی ہے۔
- مرد آنکھ ہے تو عورت اس کی بینائی ہے۔ مرد پھول ہے تو عورت اس کی خوشبو ہے۔
- جن کی ضروریات کم ہوتی ہیں وہ خدا کے نزدیک ہوتے ہیں۔
- بے وقوف ترین شخص وہ ہے جو فتنہ خفتہ کو بیدار کرے اور جو کام خوش اسلوبی سے ہو سکتا ہو اسے لڑائی جھگڑے تک پہنچا دے۔

- نعمت حق کی تلافی کیلئے تین چیزیں ضروری ہیں۔

(1) شکرِ کثیر

(2) عبادتِ لازم

(3) گناہ سے توبہ

- اعلیٰ ظرف انسان کی شناخت یہ ہے کہ دُشمن کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرے۔
- حقیقی تونگری بدن کی صحت ہے۔
- جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسے چیزوں کا علم بہت بہتر ہوتا ہے مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس پر لاعلمی کے پردے پڑتے چلے جاتے ہیں اور آخرکار استاد کا کام محض یہ رہ جاتا ہے کہ لاعلمی کے پردوں کو ہٹا دے تاکہ وہ علم ظاہر ہو سکے جو پوشیدہ ہے۔
- ہر شخص کو اپنی ضمیر کی آواز پر عمل کرنا چاہیے۔ یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ دوسرے اس کی نسبت کیا کہتے ہیں۔ ہر طبقہ کا ممدوح بننے اور ہر جماعت میں مقبول ہونے کی خواہش ایک جنون ہے۔
- عقلمند کی پہچان غصے کے وقت ہوتی ہے۔
- تین آدمی قابلِ رحم ہیں اول وہ جو کسی بد کا تابع ہو، دول وہ صاحبش عقل جس کا آقا جاہل ہو، سوم وہ سخی جو کسی کنجوس کا دستِ نگر ہو۔
- نیکی علم ہے بدی جہالت۔
- جس شخص نے اپنی زبان اور اپنے نفس کو قابو میں رکھا گویا اس نے

سینکڑوں آدمیوں کو اپنے بس میں کر لیا۔

- اپنے دوست کو اپنی خالص ترین محبت دو مگر راز نہ دو کہیں یہ اندھادھند اعتماد تمہیں ناگ کی طرح نہ ڈس لے۔
- اپنا وقت دوسروں کی تحریوں کے مطالعہ سے اپنی لیاقت بڑھانے میں صرف کرو اس طرح تم ان چیزوں کو نہایت آسانی سے حاصل کر سکو گے جن کو حاصل کرنے میں دوسروں کو محنتِ شاقہ برداشت کرنی پڑی۔
- برائی اور جھوٹ علم کی کمی کے سبب معرض وجود میں آئے۔
- اگر میری زندگی ختم نہ ہو تو بڑھاپا مجھے ستائے گا۔ میرے حواس کام نہیں کریں گے، میری فراست میں کمی آجائے گی۔ ایسے حالات میں مجھے زندگی کی چنداں ضرورت نہیں۔
- نیک خو ہونا حکمت کا خلاصہ ہے، اس سے امن اور سلامتی حاصل ہوتی ہے اور دوسروں کے دِل میں محبت پیدا ہوتی ہے۔